ماہنامہ

کراچی

آنکھ مچولی

مارچ ۱۹۹۵ء

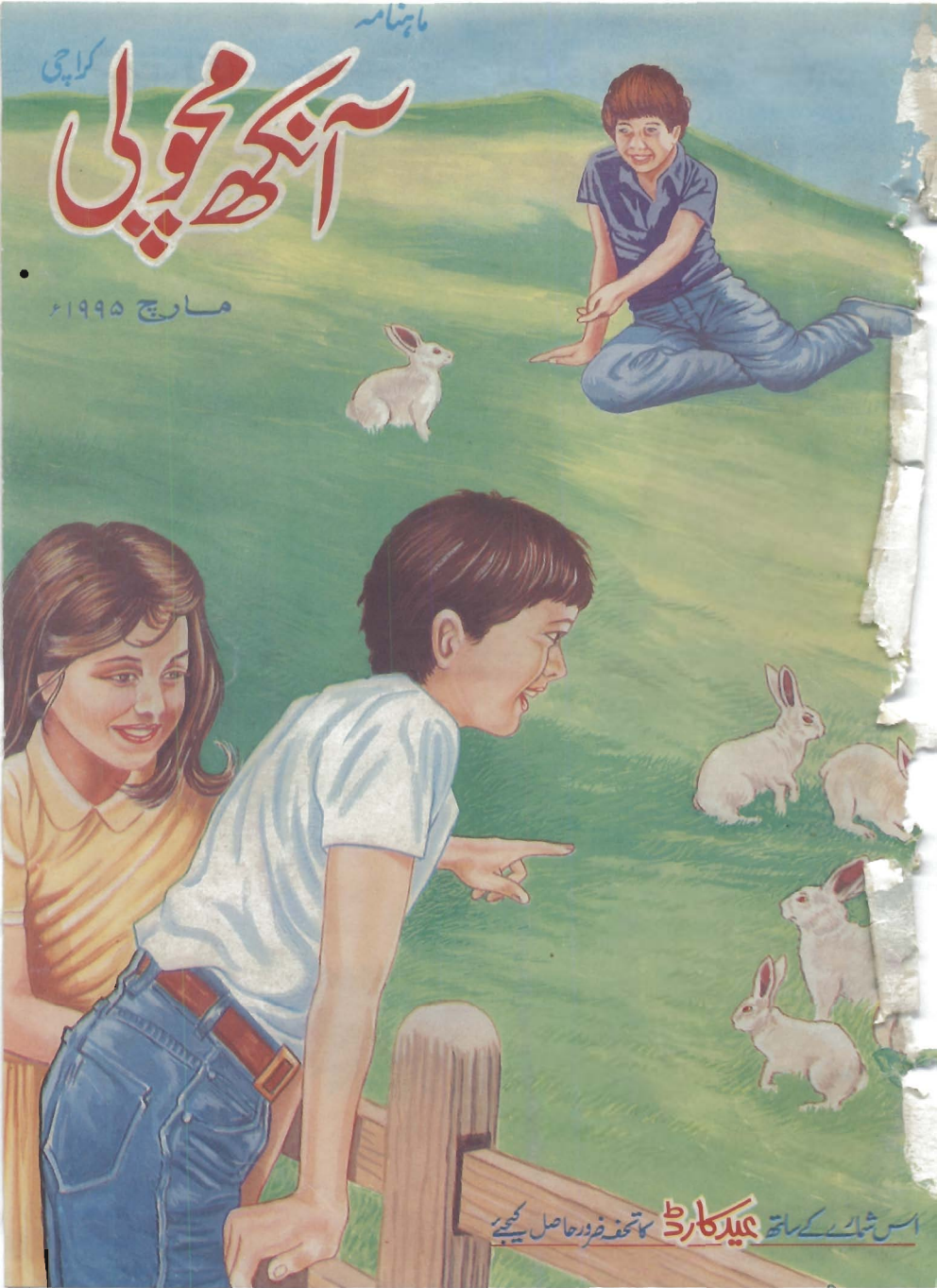

اس شمارے کے ساتھ عید کارڈ کا تحفہ ضرور حاصل کیجیے

شربت وہی ہے بہترین - رُوح کو جو پہنچائے تسکین
تسکینِ رُوح
Taskeen-e-Rooh
بہترین شربت
تسکینِ رُوح
تسکین رُوح کی ہر بوتل کے ساتھ قیمتی گلاس کا تحفہ حاصل کریں
یوٹیلٹی اسٹور پر بھی دستیاب ہے۔
کوئس فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ، حطّار
ہیڈ آفس : 11/139 جمال الدین افغانی روڈ ۔ نزد بہادر آباد، شرف آباد ۔ کراچی
فون : 4924814-4924815

بہار ہو کہ برسات **صافی** آپ کی جلد کو شاداب و شگفتہ رکھتی ہے

جڑی بوٹیوں سے
تیار شدہ

صافی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

موسموں کی تبدیلی فطرت کا تقاضا ہے لیکن اس تبدیلی سے خون میں پیدا ہونے والے فاسد مادّے امراضِ جلد کا سبب بنتے ہیں۔

صافی میں شامل مفید و مؤثر جڑی بوٹیاں خون کو قدرتی طور پر صاف اور صحت مند رکھتی ہیں اور آپ کی جلد نرم، ملائم اور چمکدار رہتی ہے۔

ہمدرد

Adarts-SAF-1/93

سوشل سیکورٹی اسکیم

محنت کشوں اور اُنکے اہلِ خانہ کو
معاشی تحفظ فراہم کرتی ہے۔

اس اسکیم کے فروغ میں

ادارہ سماجی تحفظ
ملازمین سندھ

سے تعاون کیجئے۔

منجانب ..... اراکینِ عملہ

سندھ سوشل سیکورٹی
ڈائریکٹریٹ

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رُکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۹ رمضان/شوال ۱۴۱۵ھ مارچ ۱۹۹۵ء

مدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ

تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی

طاہر مسعود

مجلس ادارت

منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

مصوّر

مومن رحیم

سرکولیشن مینجر

بابر فاروقی

مینجر اشتہارات

عمران احمد

قیمت ۱۵ روپے

۷ درہم ۷ ریال

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیرالدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۰-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۹۴۸۲۱۰ / ۴۹۴۲۸۵۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاہد علی ○ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ،

آنکھ مچولی کراچی کا خاص نمبر

مئی ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر آرہا ہے

بچوں کی صحافت میں ایک گراں قدر اضافہ — پچھلے خاص نمبروں سے مختلف بھی منفرد بھی

کہانیاں، فیچر، طنز و مزاح، معلوماتی مضامین، دلچسپ مقابلے، گدگداتے کارٹون،
مزیدار لطائف، آپ کی پسندیدہ شخصیات کے انٹرویو

اور وہ سب کچھ

جن کے بارے میں ابھی سے نہیں بتایا جا سکتا

رسالہ دیکھ کر آپ کہہ اُٹھیں گے

واقعی یہ بیش کش آنکھ مچولی ہی کی ہو سکتی ہے

آپ بھی لکھیے ——— ہر تحریر کا معاوضہ دیا جائے گا

کوئی نیا آئیڈیا ——— کوئی نیا خیال

"خاص نمبر" کے لیے ذہن میں آتے ہی فوراً لکھ بھیجیے

——— اسے آپ کے حوالے سے شائع کیا جائے گا ———

اپنی کاپی آج ہی بک کرا لیجیے

تحریریں بھیجنے کا پتہ نوٹ کر لیجیے

مدیر اعزازی "آنکھ مچولی" اپی آئی بی کالونی، کراچی ۷۴۸۰۰

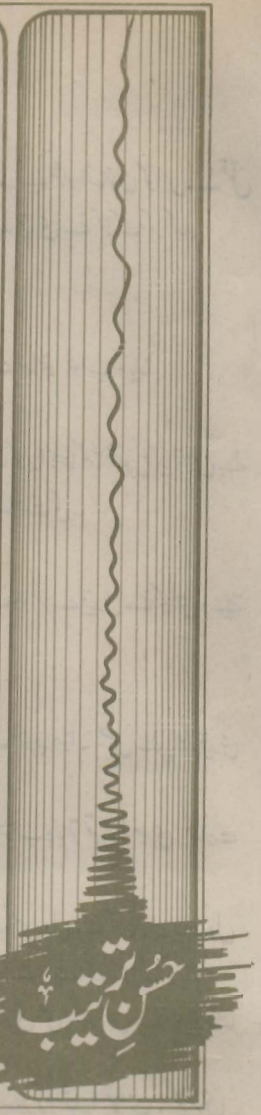

حُسنِ ترتیب

سنہرے حروف ـــــــ عبدالباسط ارشد ـــ ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات ـــــــ اداریہ ـــ ۹
حمدِ باری تعالیٰ (نظم) ـــــــ عالم شفیع ہمدم ـــ ۱۰
اسلام جیتا مسلمان ہارا ـــــــ محمّد جاوید خالد ـــ ۱۱
جگنو یا شریر ستارہ ـــــــ شیخ عاکف حمید ـــ ۱۵
گھڑی نے ایک بجایا ـــــــ نگہت آراء چوھان ـــ ۱۷
جیت ـــــــ محمّد عادل منہاج ـــ ۲۰
مکھی (نظم) ـــــــ عبّاس عالم ـــ ۲۸
اور قلعہ سر ہو گیا ـــــــ عبدالستار خان طاھر ـ ۲۹
بے چارے ـــــــ منیر احمد راشد ـ ۳۱
کولمبس اور انڈہ ـــــــ اکبر علی خان ـــ ۳۸
پالا، اولے اور برف ـــــــ سیّد عدنان یوسف ـ ۴۱
انیمی کا روپیہ (نظم) ـــــــ عبدالقادر ـــ ۴۲
تم نہیں آؤ ـــــــ شازیہ فرحین ـــ ۴۴
کرکٹ کرکٹ ـــــــ غلام عباس طاھر ـ ۴۷
سوتا جاگتا ابوالحسن ـــــــ نیّر مسعود ـــ ۵۰
کنگرو کے بھائی بہن ـــــــ عباس عالم ـــ ۵۶
پاکستان ہے اپنی جنّت (نظم) ـــــــ آصف وقار آصف ـــ ۵۹
ایک کپ چینی ـــــــ محمد شاھد فیروز ـــ ۶۰
سب سے بڑے قومی رہنما ـــــــ ڈاکٹر اسلم فرّخی ـــ ۶۴
ہنستے ہنستے ـــــــ منتخب لطائف ـــ ۶۹
تم سب میرے ہو ـــــــ ریحانہ منیر ـــ ۷۵
آنگن (نظم) ـــــــ شبیر بیگ نازؔ ـــ ۷۷
آمنے سامنے ـــــــ سلیم خالق ـــ ۷۸
بنام آنکھ مچولی ـــــــ خطوں کے جواب ـــ ۸۲
اب میں کیا کروں؟ ـــــــ ادارہ ـــ ۸۶
دامن کے ٹکڑے ـــــــ حماد خالد قیاضی ـــ ۹۱
ایٹم (نظم) ـــــــ اُفق دہلوی ـــ ۹۶
وہ کیا راز تھا؟ ـــــــ محمد عمر احمد خان ـــ ۹۸
قلم دوست ـــــــ ننھی تحریریں ـــ ۱۰۷

شہرِ حروف

حجاج بن یوسف ایک مشہور گورنر گزرا ہے۔ یہ بڑا ہی سفاک تھا، بے شمار انسانوں کو اس نے قتل کیا۔ ایک دن جب اس نے کچھ قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تو ایک قیدی نے کڑک کر کہا،

"تم مجھے ہرگز قتل نہیں کر سکتے!"

"کیوں؟" حیران ہو کر حجاج نے غضبناک لہجے میں پوچھا۔

"اس لئے کہ میرا تم پر ایک حق ہے۔" قیدی نے جرأت کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا حق ہے"؟ حجاج نے وضاحت چاہی۔

"ایک دن جب عبدالرحمٰن بن اشعثؓ نے ایک مجلس میں آپ کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو میں نے آپ کا دفاع کیا تھا اور آپ کی طرف سے جواب دیا تھا" قیدی نے وضاحت کی۔

"کیا تمہارا کوئی گواہ ہے؟" حجاج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"جی ہاں میں گواہ ہوں۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے۔" ایک دوسرے قیدی نے گواہی دیتے ہوئے کہا۔

حجاج نے سپاہیوں کو حکم دیا، "پہلے قیدی کو رہا کر دیا جائے۔"

اب حجاج غضبناک نگاہوں کے ساتھ اس دوسرے قیدی کی طرف متوجہ ہوا۔ جس نے پہلے قیدی کے لئے گواہی دی تھی، حجاج نے اس سے پوچھا۔

"اس شخص نے جب عبدالرحمٰن بن اشعثؓ کو میری طرف سے جواب دیا تو تم نے میری حمایت کیوں نہیں کی، تم نے میری برائی کیونکر برداشت کی؟"

"میں بھلا آپ کی طرف سے کیوں جواب دیتا، میں آپ کی حمایت کس دل سے کرتا، میرے دل میں تو برسوں سے آپ کے خلاف نفرت اور بغض بھرا ہوا ہے۔" قیدی نے بے لاگ جواب دیا۔

حجاج کو اس قیدی کی صاف گوئی اور بے خوفی پر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی، اور اس نے اسی وقت حکم دیا۔

"جاؤ تمہیں بھی رہا کیا جاتا ہے۔"

مرسلہ: عبدالباسط راشد اعوان، کوٹری

پہلی بات

نیوٹن کسی باغ میں بیٹھا ستا رہا تھا کہ اس نے ایک درخت سے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا۔ معاً اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس نے سوچا یہ سیب گر کر نیچے زمین ہی کی طرف کیوں آیا؟ یہ کسی اور طرف کیوں نہیں چلا گیا۔ نیوٹن یہی سوال اس وقت کسی اور سے کرتا تو وہ نیوٹن کو احمق، دیوانہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہتا۔ لیکن نیوٹن سوچتا رہا اور بعد میں اسی غور و فکر سے کششِ ثقل کا قانون اس نے دریافت کیا۔

اس واقعے پر غور کیجئے تو یہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

۱۔ ایک عالم اور جاہل میں فرق یہ ہے کہ عالم سوچتا ہے اور جاہل نہیں سوچتا۔ یہی فرق ایک عقل مند اور بے وقوف میں بھی ہے۔ گویا سوچنا ایک اہم کام ہے۔ آج دنیا میں جتنی بھی ترقی دکھائی دیتی ہے، وہ سب انسان کے سوچنے ہی کی وجہ سے ہے۔ پس ہمیں بھی سوچنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔

۲۔ سوچنا ہم اس وقت شروع کرتے ہیں جب کچھ سمجھنا چاہتے ہیں۔ یعنی سوچنے کے لئے ذہن میں کسی نہ کسی سوال کا ہونا ضروری ہے۔ سیب کو گرتے دیکھ کر نیوٹن کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا تھا۔ اگر اس کے ذہن میں سوال نہ ہوتا تو وہ سوچنے کی تکلیف ہی کیوں اٹھاتا۔ ہمیں بھی "کیوں؟" "کیا؟" اور "کیسے؟" جیسے سوالوں کو اپنے ذہن میں زندہ رکھنا چاہئے۔

۳۔ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے کسی سوال یا خیال کو حقیر اور بے کار نہیں سمجھنا چاہئے۔ اکثر ہم بہت سے سوالوں کو معمولی سمجھ کر جھٹک دیتے ہیں حالانکہ یہی سوالات سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اگر نیوٹن بھی اپنے سوال کو معمولی سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیتا تو کیا ہوتا؟

۴۔ جب کوئی سوال ذہن میں پیدا ہو جائے تو پھر اس کا ہر صورت میں جواب حاصل کرنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی بارے میں سوچتے ہوئے ہمیں کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ خواہ مخواہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۵۔ نیوٹن نے سیب کو گرتے دیکھ کر اس لئے سوچنا شروع کیا کہ سوچنا اس کی عادت تھی۔ سوچ بچار حقیقتاً ایک عادت ہی کا نام ہے۔ شروع شروع میں ہمیں سوچنے کے لئے ذہن پر زور دینا پڑتا ہے لیکن جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر سوچنے کا عمل از خود ذہن میں جاری رہتا ہے۔

نیوٹن کے اس واقعے کو آپ نے اب تک نہ جانے کتنی بار پڑھا اور سنا ہو گا لیکن اس واقعے میں سیکھنے اور سمجھنے کے اتنے پہلو ہو سکتے ہیں، شاید اس پر آپ نے غور نہ کیا ہو۔ یہ بھی سوچنے کی بدولت ہی ممکن ہوا۔ پس سوچنا شروع کیجئے کیونکہ سوچنے کی صلاحیت انسان ہی کے پاس ہے حیوان کے پاس نہیں۔

آپ کا دوست طاہر مسعود

حمد باری تعالیٰ

عالم شفیع ہمدم

سب کے داتا سب کے والی رُتبہ تیرا سب سے عالی
پھولوں میں ہے تیری خوشبو تیرے ہی چرچے ہیں ہر سُو
باغِ جہاں کا تو ہے مالی

سارے جہاں کا رازق ہے تو دو عالم کا خالق ہے تو
دونوں جہاں کا تو ہے مالی

پیدا زورِ اخوت کر دے ہم پہ اپنی رحمت کر دے
رحمت کر دے جگ کے والی

سب کی مشکل حل کرتا ہے سب کا دامن تو بھرتا ہے
عالمؔ بھی ہے تیرا سوالی
سب کے داتا سب کے والی

اسلام جیتا مسلمان ہارا

محمد جاوید خالد

وہ ایک جج تھا۔ انگریز تھا مگر انصاف پسند۔ انصاف معاشرے کا زیور ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں جب تک انصاف ہوتا رہے گا وہ معاشرہ قائم رہے گا۔ عدل پر آنچ آئی اور معاشرہ زوال کا شکار ہوا۔ تاریخ اور تجربہ دونوں یہی بتاتے ہیں۔ وہ صرف انصاف پسند ہی نہیں تھا، ذی علم بھی تھا اور معاملہ چونکہ ہندوستان کا تھا اس لئے یہاں بسنے والی مختلف قوموں کے عقائد اور مذاہب کے بارے میں وہ بخوبی جانتا تھا۔ اس نے زندگی میں کئی فیصلے کئے تھے اور بڑی عمدگی کے ساتھ۔ لیکن اب ایک ایسا مقدمہ اس کی عدالت میں آیا ہوا تھا کہ وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ وہ پریشان تھا اور کئی برسوں سے پریشان تھا۔

یہ پاکستان بننے سے بھی تقریباً ایک صدی پہلے کی بات ہے۔ ہندوستان پر انگریز کی حکومت تھی۔ انگریز کی عدالت تھی اور مقدمے کے فریق ہندو اور

مسلمان دونوں تھے۔ معاملہ ایک مسجد کا تھا۔ یوپی کی ایک جامع مسجد تعمیر ہو رہی تھی۔ جھگڑا مسجد کے ساتھ ملی ہوئی کچھ زمین کے بارے میں تھا۔ مسلمان اسے مسجد کی ملکیت قرار دے کر مسجد کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ مسجد کشادہ ہو جاتی مگر ہندو دھرم کے پجاری آڑے آ گئے۔ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین کسی زمانے میں ان کے مندر کا حصہ تھی۔ دونوں عدالت تک پہنچے مگر حتمی ثبوت کسی کے پاس بھی نہ تھا۔ معاملہ مذہبی تھا اور مذہب کے معاملے میں سب حساس اور پرجوش ہوتے ہیں۔ جج کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

آخر اس نے مقدمے کے دونوں فریقوں سے الگ الگ گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پہلے مسلمانوں کو بلایا۔ ان سے گفتگو کی۔ ان سے پوچھا کہ کیا وہ کسی ایسے ہندو کی گواہی لا سکتے ہیں جو یہ کہہ دے کہ یہ زمین مسجد کی ہے۔ مسلمانوں نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی نظر میں ایسا کوئی ہندو نہیں ہے۔ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور انہیں کسی ہندو سے یہ امید نہیں کہ وہ انصاف کے ساتھ سچی بات کہہ دے اور گواہی دے دے کہ زمین مسجد کی اور مسلمانوں کی ہے۔

جج نے اگلی ملاقات ہندوؤں کے ساتھ کی اور یہی سوال ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ وہ کسی مسلمان کی گواہی لے آئیں جو یہ کہہ دے کہ زمین مندر کی ملکیت ہے تو وہ فیصلہ ان کے حق میں کر دے گا۔ مسلمان صاحب کردار ہوتا ہے۔ ہندو فوراً انکار میں سر نہ ہلا سکے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ پھر جج سے کہنے لگے کہ اگرچہ یہ معاملہ اب قومی عزت کا سوال بن گیا ہے اس لئے شاید کوئی مسلمان ان کے حق میں گواہی نہ دے سکے لیکن بستی میں ایک بزرگ ایسے ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ انہیں یقین ہے کہ وہ کسی مصلحت سے کام نہ لیتے ہوئے سچی گواہی دیں گے۔

خوبی وہ ہوتی ہے جس کا اقرار دشمن بھی کرے۔ یہ مسلمان جس کے سچ کی گواہی ہندو دے رہے تھے اور جس کی گواہی پر ان کے مقدمے کا انحصار تھا، مولانا محمود بخش تھے۔ مولانا محمود بخش، ایک سیدھے سادھے مسلمان بظاہر ان میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی مگر اہم ترین بات یہ تھی کہ وہ سرتاپا مسلمان تھے اول و آخر مسلمان اور باطن و ظاہر مسلمان۔ صرف خدا سے ڈرنے والے۔ حق ان کے دل و دماغ میں بستا تھا اور سچ ان کے لبوں پر رہتا تھا۔ جج نے فوراً اپنا آدمی ان کے پاس بھیجا کہ مقدمے میں ان کی گواہی کی ضرورت ہے وہ عدالت میں آ کر اپنا بیان دیں۔ جج منتظر تھا کہ اس کا ہرکارہ مولانا کو ساتھ ہی لے آئے گا مگر ہرکارہ تنہا واپس آیا اور اس نے یہ خبر سنائی کہ مولانا نے عدالت میں آنے سے انکار کر دیا ہے۔ "لیکن انہوں نے کیا کہا؟" جج نے پوچھا تو چپڑاسی نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ انہوں نے قسم کھائی

ہے کہ زندگی میں فرنگی کی شکل نہ دیکھیں گے۔

جج سوچ میں پڑ گیا اس نے چپڑاسی کو دوبارہ بھیجا۔ مولانا کو کہلوایا کہ وہ تشریف لے آئیں۔ اس لئے کہ ان کے بیان پر ایک اہم مقدمے کا فیصلہ ہونا ہے۔ جہاں تک انگریز کی شکل نہ دیکھنے کی قسم کا تعلق ہے تو اس کا انتظام کر دیا جائے گا کہ کوئی انگریز ان کے سامنے نہ آئے۔ اس کے باوجود جج کو اندیشہ تھا کہ اتنا مضبوط آدمی آسانی سے آنے کو تیار نہ ہوگا۔ اس نے نفسیاتی وار کیا۔ چپڑاسی سے کہا ان سے یہ بھی کہنا کہ آپ کی مذہبی کتاب قرآن مجید میں بھی یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو چھپائے نہیں بلکہ پیش کرے۔

جج کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ مولانا عدالت میں تشریف لائے۔ جج اندر دروازے کے پاس بیٹھ گیا اور مولانا دروازے کے باہر کھڑے رہے۔ مولانا کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا مجمع بھی موجود تھا۔ اس مجمع میں ہندو بھی بہت تھے اور مسلمان بھی بے شمار۔ سب کی نظریں مولانا کی طرف تھیں۔ ملے جلے جذبات لئے سب کے دل دھڑک رہے تھے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟ مولانا کیا کہتے ہیں؟

جج نے بلند آواز سے پوچھا کہ مولانا محمود بخش صاحب یہ بتائیے کہ یہ متنازعہ جگہ مسلمانوں کی ہے یا ہندوؤں کی؟ مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے اور مسلمانوں کا دعویٰ اس بارے میں غلط ہے جج نے اگلے ہی لمحے فیصلہ دے دیا۔ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ کمرۂ عدالت نعروں سے اور شور سے گونج اٹھا۔ نعرے ہندوؤں کے تھے فاتحانہ اور پرجوش۔ شور میں اکثر مسلمان شامل تھے جو بہت دلبرداشتہ تھے۔ ان کے دل و دماغ پر شکست کا احساس چھا گیا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور منہ سے اس طرح کے جملے نکل رہے تھے کہ مولانا صاحب نے بہت بُرا کیا۔ مولوی صاحب نے اپنی قوم کو غیروں کے سامنے رسوا کر دیا۔

مولوی صاحب قرآن پاک پر عمل پیرا تھے۔ وہی قرآن پاک جس میں رہتی دنیا تک یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ "عزت والا وہ ہے جس کا تقویٰ زیادہ ہے۔" اور تقویٰ کا تقاضا تھا کہ کچھ ہو جائے سچ کہا جائے۔ مولوی صاحب ذات، برادری اور قوم کی پرواکیوں کرتے؟ مگر سچ کو وقتی پریشانی تو ہو سکتی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ انجام کے لحاظ سے بھی ناکام ہو۔ مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے لیکن ایک مسلمان نے سچ پر آنچ نہیں آنے دی۔ پرجوش ہندوؤں نے فوراً ہی متنازعہ جگہ پر مندر کی تعمیر شروع کر دی۔ مسجد کے پہلو میں بت خانہ بن گیا لیکن ابھی سچ کا نتیجہ باقی تھا۔ جذبات کا طوفان تھم گیا تو ہندوؤں کے اندر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ان کے دلوں میں اس دین مبین کی جگہ بننا شروع ہو گئی جس نے اپنے ایک ماننے والے کو اتنی زبردست قوت ارادی دے دی تھی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملے میں اور جذبات کے سخت طوفان میں

بھی حق وانصاف کے راستے سے نہیں ہٹا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بتوں کے پجاریوں ہی میں سے کلمۂ توحید کے شیدائی نکل آئے۔ سیکڑوں ہندوؤں نے مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر مولانا محمود بخش مصلحت سے کام لیتے، قوم کی خاطر جذبات کا شکار ہو کر غلط گواہی دے دیتے، جھوٹ بول دیتے تو یہ تو ہو جاتا کہ مسجد وسیع ہو جاتی مگر خدا کے دین کو جو وسعت ملی وہ حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اسلام اسی لئے ایک زندہ دین ہے کہ وہ مال، دولت، نعرے، دلائل، زمین طلب نہیں کرتا وہ تو صرف ایک چیز چاہتا ہے کردار۔ باقی سب چیزیں اسی کے تابع ہیں۔ یہ مسلّی کردار نہ ہوتی تو کیا اسلام سرزمین مکہ سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل سکتا تھا؟ اور کیا دشمنوں کی ڈیڑھ ہزار سال کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود خدا کا یہ دین اپنی آفاقی تعلیمات کے ساتھ زندہ و پائندہ رہ سکتا تھا۔ یقیناً نہیں۔ ہرگز نہیں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام سے کردار کو اور کردار سے اسلام کو نکال دیا جائے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا نہ اسلام نہ کردار۔ ■

اِسے پلُو سے باندھ لیجیے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

بچوں کے مشہور و معروف مصنف

اشتیاق احمد

کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور ناول

۵۹۲ — قاتل کا قاتل — انسپکٹر جمشید سیریز — ۱۵ روپے

۵۹۳ — بھوت کی چوری — " — ۱۵ "

۵۹۴ — خوشبو کا پھندا — " — ۱۵ "

۵۹۵ — مکھیوں کے قیدی — " — ۱۵ "

۸۷ — خطوط کا فریب — " — ۱۵ "

۸۸ — خون آلود خنجر — " — ۱۵ "

۸۹ — گمنام ہمدرد — " — ۱۵ "

۹۰ — رے راٹا — " — ۱۵ "

۲۰ مارچ ۱۹۹۵ء

کو آپ کے شہر میں ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب

ہیں یا

پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانده کلاں لاہور، — فون ۷۲۴۶۳۵۴

جگنو یا شریر ستارہ

شیخ عاکف حمید

پیارے بچو! ہماری زمین پر بہت سے اسکول ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آسمان پر بھی ایک اسکول ہے؟

یہ کہانی اسی اسکول کی ہے جو آسمان پر ہے۔ جب سورج ڈوب جاتا، جب دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں پر پوری طرح خاموشی چھا جاتی تو بہت سے ننھے ستارے آہستہ آہستہ اپنے گھروں سے نکل کر اسکول کی طرف چل دیتے۔

لو جی اسی اسکول میں چندا ماموں ستاروں کے جھرمٹ میں پڑھاتے۔ انہیں اپنے شاگردوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ تمام ستارے ہمیشہ چمکتے رہیں۔ ہمیشہ دمکتے رہیں۔

مسکراہٹ کا تحفہ

"ہمارے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: تم لوگ ایک دوسرے کو تحائف دیتے رہا کرو۔ ایک شخص نے فرمایا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی کے پاس تحفہ نہ ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم کسی کو اپنی مسکراہٹ بھی نہیں دے سکتے؟"

مرسلہ: شائستہ شفیق الرحمٰن. حیدر آباد۔

ستارے بھی بڑے پیارے تھے۔ جی لگا کر اپنا سبق یاد کرتے۔ سبق یاد کرتے ہوئے وہ ہمیشہ سوچتے کہ بڑے ہو کر چاروں طرف اپنی روشنی پھیلائیں گے۔

کتنے پیارے ستارے تھے۔ مگر اعلیٰ ستاروں میں ایک ستارہ بڑا نٹ کھٹ اور شریر تھا۔ سبق کی طرف کبھی دھیان نہ دیتا۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، یہاں تک کہ پڑھتے وقت بھی اسے نت نئی شرارت سوجھتی تھی۔

تمام ستاروں کا یہ دستور تھا کہ اسکول جاتے وقت اپنے گھروں سے روشن قندیلیں ہاتھ میں لے کر نکلتے تاکہ اندھیری راتوں میں بے چارے مسافروں کو راستہ دکھائیں لیکن وہ شریر ستارہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ وہ تو اپنے ساتھیوں کی قندیلیں بھی چھین لیتا۔ اس کے ہمجولی اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتے، مگر وہ الٹا انہیں اور زیادہ زچ کرتا۔

آخر تنگ آکر ستاروں نے مل کر مشورہ کیا کہ اس شرارتی طالب علم کو سزا دلوائی جائے۔ ستاروں نے ایک ہو کر چندا ماموں سے شکایت کی۔ چندا ماموں نے سب کی بات سنی تو بولے۔

"اپنے دوست کو دوست بناؤ چغلی کھانا اچھی بات نہیں اگر وہ ایسا ہی شریر ہے تو ہم اس کو شرارت کا مزہ چکھا دیں گے۔"

ایک گہری شام چندا ماموں ستاروں کے جھرمٹ میں پڑھانے میں مصروف تھے سب پر ان کی نظر تھی وہ دیکھ رہے تھے کہ شریر ستارہ نظر بچا بچا کر اپنے ہمجولیوں کے گدگدی کرتا اور وہ کبھی چٹکی بھرتا ہے۔ چندا ماموں نے یہ سب کچھ دیکھا تو اسے پیار سے سمجھایا مگر وہ کچھ نہ سمجھا۔ اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا۔ وہ اپنے ہمجولیوں کو برابر تنگ کرتا رہا۔

آخر چندا ماموں نے اسے اس زور کی قینچی ماری کہ وہ شریر ستارہ قلا بازیاں کھاتا ہوا ایسا بھاگا کہ اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

پیارے بچو! آپ نے کبھی رات کے وقت ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے؟ دیکھا ہے نا؟ بس یہ وہی شوخ ستارہ ہے جو آسمان سے گر کر ہماری زمین کے کسی کونے میں آباد ہو گیا۔

ایک رات امجد نے پھولوں کی کیاری میں ایک شوخ ستارے کو جھلملاتے دیکھا وہ اسے پکڑ کر اپنی امی کے پاس لایا اور کہا کہ "امی جان یہ وہ ستارہ ہے جو اس روز آسمان سے ٹوٹا تھا۔" امی بولیں۔ "ہاں بیٹا یہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے اب ستارہ نہیں رہا۔ اب اسے جگنو کہتے ہیں۔" ■

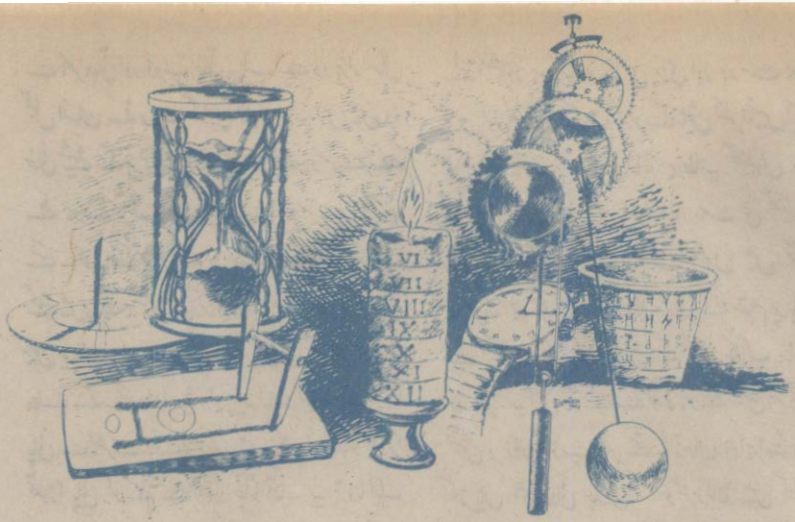

گھڑی نے ایک بجایا

نگہت آرا چوہان

جب ہم گھڑی کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد وقت ناپنے کا آلہ ہوتا ہے۔ لیکن انسان نے وقت ناپنے کے لئے کسی آلے کی ایجاد سے بہت پہلے ہی بہت سے مختلف طریقے ایجاد کر لئے تھے۔ سورج کا طلوع اور غروب ہونا انسان کیلئے وقت کا پہلا پیمانہ تھا۔ لکڑی، پتھر اور درختوں کے سایوں کے لمبے اور مختصر ہونے سے بھی انسان کو وقت کا پتہ چل جاتا اور ستاروں کی نقل و حرکت اس کے لئے ایک عظیم کلاک ثابت ہوتی۔ انسان نے معلوم کیا کہ جیسے جیسے رات گذرتی، کچھ ستارے نظر آنے لگتے۔

قدیم مصریوں نے رات کو بارہ ستاروں کے نکلنے سے بارہ درجوں میں تقسیم کیا۔ انہوں نے دن کو بھی بارہ وقفوں میں تقسیم کیا اور ہمارا چوبیس گھنٹے کا دن رات مصری تقسیم ہی کی بنیاد پر ہے۔

مصریوں نے سایہ گھڑیاں بھی بنائی تھیں۔ یہ لکڑی کے مختلف قسم کے بلاک ہوتے تھے۔ یہ سایہ یا دھوپ گھڑیاں بارہ درجوں میں ہوتے اور یہ ابتدائی گھڑیاں تھیں۔ اس کے بعد انسان نے آگ اور پانی کی گھڑیاں بھی بنائیں۔ ایک موم بتی جس پر نشان لگے ہوتے تھے جلا دی جاتی اور ایک نشان سے دوسرے نشان تک جلنے سے وقت ناپ لیا جاتا۔

ایک پلیٹ میں چھوٹا سا سوراخ کر کے پانی پر رکھ دیا جاتا۔ ایک خاص وقت کے بعد پلیٹ پانی

سے بھر جاتی اور ڈوب جاتی۔ اب سے دو ہزار سال قبل انسان نے ریت گھڑی ایجاد کی۔ اس میں دو خالی شیشے کے برتن ہوتے تھے جو ایک دوسرے سے ملے ہوتے تاکہ ریت ایک سے دوسرے میں جا سکے۔ اوپر کے برتن میں ریت بھر دی جاتی جو ایک گھنٹے میں نچلے برتن میں گر جاتی۔ ۱۴۰ سال قبل مسیح میں یونانیوں اور رومیوں نے پانی کی گھڑی کو بہتر بنانے کے لئے دندانے دار پہیہ ایجاد کیا۔ ایک ترونا پانی سے بھرے ہوئے برتن میں لگا دیا جاتا جو تھوڑا تھوڑا پانی گرنے سے اٹھ جاتا تھا۔ یہ ترونا ایک دندانے دار پہیے سے منسلک تھا۔ یہ پہیہ ایک پوائنٹر کو چلاتا جو آہستہ آہستہ ایک گھنٹے کے نشان سے دوسرے گھنٹے کے نشان پر حرکت کرتا۔ پہلا میکانکی کلاک تقریباً چودہ سو سال پہلے ایجاد ہوا۔ ایک تار سے ایک وزن منسلک کر دیا جاتا جو ایک ریل کو چلاتا۔ جیسے ہی ریل کھلتی یہ گھومنے لگتی، جس سے چھوٹے چھوٹے دندانے دار پہیے گھومتے اور ان پہیوں سے ڈائل پر لگی سوئی گھومتی۔

مشینی گھڑیوں کے ابتدائی زمانے میں کوئی خاص ملک گھڑی اور گھڑیالوں کی پیداوار میں خصوصیت نہیں رکھتا تھا۔ ماہرین ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہوتے رہتے اور گھڑی بنانا بین الاقوامی تجارت بن گیا۔ لیکن جلد ہی مختلف ملکوں میں مختلف قسم کی خاص گھڑیاں بننے لگیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ خاص قسم کی بحری جہاز کی گھڑیاں بنانے کے لئے مشہور ہو گیا جو خاصی بڑی اور درست ہوتی تھیں اور سمندر کے مدّو جزر کے پیش نظر انہیں ایک خاص بریکٹ پر رکھا جاتا۔ برطانیہ گھنٹیوں والی گھڑیاں بنانے میں بھی ماہر تھا اور بہت سی گھنٹیوں والی گھڑیاں دنیا کے مختلف ملکوں میں بھیجی جاتیں۔ جرمنی میں بلیک فارسٹ کے مقام پر ہاتھ سے نقش کئے گئے لکڑی کے ککو کلاک بنائے جاتے۔ یہ اعلیٰ درجے کے تو نہ ہوتے لیکن لکڑی پر نقش و نگار جاذب نظر تھے۔ یہاں جواہرات والی گھڑیاں بھی بنائی جاتیں۔ سوئٹزرلینڈ میں گھڑی سازی قومی صنعت ہے اور ملکی معیشت کے لئے بے حد اہم۔ سوئس لوگوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں گھڑی سازی میں مہارت پیدا کی جب کلائی کی گھڑی ایجاد ہوئی۔

سوئس اعلیٰ درجے کی چھوٹی گھڑیاں بنانے کے ماہر ہیں اور خاص شکلوں والی گھڑیاں، مثلاً الارم کلینڈر اور خود کار گھڑیاں سوئٹزرلینڈ میں اعلیٰ پیمانے پر تیار کی جاتی ہیں۔

امریکہ میں زیادہ تر بجلی کی گھڑیاں بنائی جاتی ہیں اور موٹروں کی گھڑیاں اور سستے الارم کلاک وغیرہ۔ امریکہ میں گھڑیوں کے مختلف حصے بھی الگ الگ باہر سپلائی کئے جاتے ہیں اور کچھ امریکی کمپنیاں سوئٹزرلینڈ، جرمنی، جاپان اور فرانس سے گھڑیاں منگواتی ہیں۔

جہانِ نو

عجیب و غریب سائیکل

یہ ایک فل سائز کی سائیکل ہے جو فولڈ ہو کر آپ کے ٹرنک میں سما سکتی ہے اس سائیکل کے آٹھ فٹ کے فریم کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے سائیکل فولڈ ہونے کے بعد تین فٹ چوڑی تین فٹ لمبی اور موٹائی میں ایک فٹ ہو جاتی ہے۔

سونی کی طرف سے متعارف کرایا جانے والا یہ موبائل ٹیلی فون بالکل ایک ٹیلی کارڈ کی مانند ہے اس کی لمبائی ساڑھے تین انچ چوڑائی ڈھائی انچ جبکہ موٹائی ایک انچ ہے اس کا وزن تقریباً ساڑھے چھ اونس ہے اس کی بیٹری کی کارکردگی بھی دوسری بیٹریوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

پاکٹ ٹیلی فون

سائیکل کار

یہ دو سیٹوں والی سائیکل کار ہے جس کے تین پہیے ہیں اور یہ ایک موٹر بائیک کی طرح اوپن ایئر لک سے اسٹارٹ ہوتی ہے اس میں ۵۰، ۷ سی سی کا انجن نصب ہے اور اس کی اسپیڈ ۱۲۵ میل فی گھنٹہ ہے۔

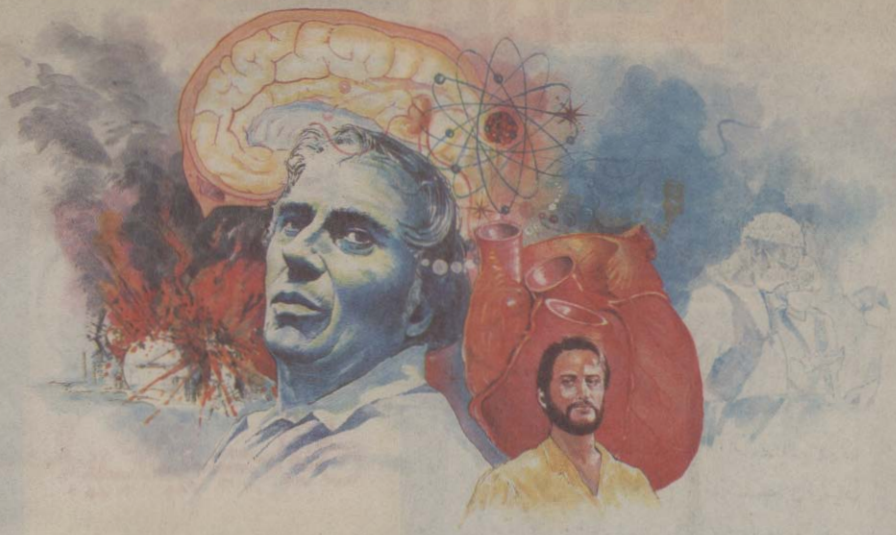

جیت

محمد عادل منہاج

مستقبل کی ایک کہانی

"اب کیسی حالت ہے ڈاکٹر؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں آپ کو کوئی امید نہیں دلا سکتا صدر صاحب، ان کا مرض بگڑ چکا ہے وہ اب غالباً بچ نہیں سکیں گے۔" ڈاکٹر نے بہت ادب سے جواب دیا کیونکہ اس کے سامنے ملک کا صدر بیٹھا تھا۔

"یہ۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر۔ آپ جانتے ہیں کہ پروفیسر ڈک ہمارے ملک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں اور آج کل وہ ایک بہت اہم ایجاد پر کام کر رہے تھے۔

اور یہ کام پروفیسر ڈک کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا۔۔ کچھ کریں ڈاکٹر۔۔ ان کی زندگی بچانے کی لئے جو بھی ہوسکتا ہے، کریں۔" صدر فکرمند لہجے میں بولا۔

"اوہ۔۔!" صدر کی بات سن کر ڈاکٹر کے منہ

سے نکلا۔ "دیکھیں سر، پروفیسر کی زندگی کی طرف سے تو ہم بالکل مایوس ہو چکے ہیں تاہم ایک طریقہ ہے کہ پروفیسر ڈک زندہ رہ سکیں۔"

"وہ کیا؟" صدر نے جلدی سے پوچھا۔

"موت دراصل دل کی دھڑکن رک جانے کا نام ہے تاہم انسان کا دماغ کبھی نہیں مرتا۔ چونکہ انسان خود مر جاتا ہے اس لئے وہ اپنے دماغ سے کوئی کام نہیں لے سکتا۔ ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ کسی مرتے ہوئے انسان کا دماغ کسی دوسرے زندہ انسان کے سر میں ڈال دیں۔"

"اوہ — آپ کا مطلب ہے کہ پروفیسر ڈک کا دماغ نکال کر کسی اور تندرست شخص کے جسم میں ڈال دیا جائے۔" صدر کے منہ سے نکلا۔

"ہاں — اس طرح پروفیسر ڈک اس دوسرے شخص کے جسم میں زندہ رہیں گے۔ جسم کسی اور کا ہو گا لیکن وہ خود کو پروفیسر ڈک سمجھے گا کیونکہ سوچنے سمجھنے کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے یوں پروفیسر ڈک اپنے تجربے کو مکمل کر سکیں گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہوں — مگر جس شخص کے جسم میں دماغ ڈالا جائے گا، اس کا کیا بنے گا؟" صدر نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے کہ اس شخص کو تو قربان کرنا ہی ہو گا۔ پروفیسر کو زندہ رکھنے کے لئے ایک شخص کی موت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر — آپ اس آپریشن کی تیاری کریں۔ میں اس شخص کا بندوبست کرتا ہوں جو پروفیسر ڈک کی جگہ لے گا۔" صدر یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

اس نوجوان نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ مم — میں کہاں ہوں؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں — پروفیسر ڈک۔" ڈاکٹر نے اس کا نام زور دے کر کہا۔

"میں — اوہ ہاں — میں خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔ یوں لگتا ہے کبھی بیمار ہوا ہی نہیں — مم مگر — یہ ہوا کیسے؟ میں تو موت کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔" اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہم نے دراصل ایک انوکھا تجربہ کیا ہے۔" ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔

"انوکھا تجربہ —!!" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں —" ڈاکٹر بولا پھر اس نے اس تجربے کی تفصیل سنائی۔

"کیا —!!" وہ چونک کر بستر پر اٹھ کر بیٹھا۔

"یہ — یہ — میں نے کیا سنا ہے؟ — اوہ — یہ — یہ تو واقعی میرا جسم نہیں — مم — مگر — یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" پروفیسر ڈک نے خود کو ٹٹولا۔

"ہو سکتا نہیں، ہو چکا پروفیسر، ہو چکا ہے۔ آپ کا دماغ اس جسم میں ہے یوں آپ ایک نئے جسم کے ساتھ زندہ ہیں۔"

"اوہ — مگر یہ جسم کس کا ہے۔ جس شخص کا بھی ہے — اس نے اس نے خود مرنا قبول کر لیا؟" پروفیسر بڑبڑایا۔

"بھلا کون شخص مرنا پسند کرتا ہے۔ یہ جسم دراصل ایک قیدی کا ہے۔ وہ ایک مسلمان دہشت گرد تھا اور کسی خاص مشن پر ہمارے ملک میں آیا تھا۔ بالآخر وہ پکڑا گیا اور اسے سزائے موت سنائی گئی۔ ہم نے سوچا کہ اسے تو مرنا ہی ہے کیوں نہ اسے ہی قربان کر دیا جائے۔" صدر نے بتایا۔

"اوہ — آپ نے میرا دماغ ایک مسلمان قیدی کے جسم میں ڈال دیا۔" پروفیسر جھنجھلا کر بولا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے پروفیسر۔ اب تو یہ جسم آپ کا ہے۔ یہ ہمارے لئے بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ زندہ سلامت موجود ہیں اور اب اپنی ایجاد مکمل کر سکیں گے اور وہ خطرناک نیوکلیئر بم بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔" صدر نے کہا۔

"ہاں — ایسا نیوکلیئر بم جو پورے ملک کو چند سیکنڈوں میں تباہ کر ڈالے۔" پروفیسر بڑبڑایا۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

پروفیسر ڈک ایٹمی پلانٹ میں موجود اپنی تجربہ گاہ میں مصروف تھا۔ میز پر فائلوں اور کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پروفیسر ایک کاغذ پر کچھ فارمولے لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ بار بار لکھتا، کاٹتا اور سوچنے کے بعد پھر لکھتا۔

"میرا خیال ہے یہ فارمولا ہر طرح فٹ ہے۔ اب مجھے تجربہ کر کے دیکھ ہی لینا چاہیئے۔" پروفیسر آہستگی سے بولا اور اس نے قلم رکھ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"بس چند دنوں کی بات ہے پھر نیوکلیئر بم بن جائے گا۔ جس کا سب سے پہلا تجربہ ہم ان بنیاد پرست مسلمان ملکوں پر کریں گے۔ نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے انھیں۔" وہ سوچ رہا تھا۔

"مگر ایسا کر کے ہمیں کیا ملے گا؟ آخر ہم مسلمانوں کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟" اس کے اندر سے آواز ابھری اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"یہ کون بولا تھا؟ — حیرت ہے — میں نے تو کبھی اس طرح نہیں سوچا — پھر آج میرے دل میں مسلمانوں کی ہمدردی کے جذبات کہاں سے آ گئے۔" اس نے حیرت سے سوچا۔

"اس لئے پروفیسر — کہ اس جسم میں صرف دماغ تمہارا ہے — یہ جسم ایک پکے سچے مسلمان کا ہے۔ اس میں دھڑکنے والا دل ایک نیک انسان کا ہے۔ اس دل میں انسانیت سے محبت کے جذبات بھرے ہیں۔" یہ آواز گویا اس کے اندر سے نکل رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر اپنا سر پکڑ لیا۔

"یہ — یہ آج کیا ہو رہا ہے۔ وہ مسلمان قیدی تو مر چکا ہے — سوچا تو دماغ سے جاتا ہے اور — اور — یہ دماغ میرا ہے۔ پھر — پھر یہ سوچیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ یہ آوازیں کہاں سے ابھر رہی ہیں۔

اف ــ مم ــ میرا خیال ہے مجھے ڈاکٹر سے ملنا چاہئے۔"

☆ ..... ☆ ..... ☆

"آپ کی باتیں سن کر میں بہت حیران ہوں پروفیسر ــ آپ کا خیال درست ہے کہ جسم تو محض دماغ کے احکامات پر عمل کرتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو دماغ میں ہوتی ہے۔ اسی لئے اگر دماغ پر ذرا سی بھی چوٹ لگے تو انسان پاگل یعنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"تو پھر ڈاکٹر صاحب ــ میرے دماغ میں یہ سوچیں کہاں سے آگئیں آخر ــ یہ مسلمانوں سے ہمدردی، انسانیت سے محبت کے خیال میرے دماغ میں پہلے تو کبھی نہیں آئے۔" پروفیسر بولا۔

"میرا خیال ہے یہ سوچیں آپ کے دماغ میں نہیں، دل میں پیدا ہوئی ہیں کیونکہ یہ دل آپ کا نہیں، ایک مسلمان کا ہے۔" ڈاکٹر سوچ میں گم بولا۔

"کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب ــ دل کا سوچنے سے کیا تعلق ــ دل کا کام محض خون پمپ کرنا ہے ــ بھلا دل میں کوئی سوچ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟" پروفیسر منہ بنا کر بولا۔

"میرا اپنا بھی یہی خیال تھا مگر پروفیسر صاحب، شاید آپ کو پتہ نہیں، چند سائنس دانوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت صرف دماغ میں ہی نہیں ہوتی ــ دل بھی اس میں اہم کردار ادا کرتا ہے ــ ان کا کہنا ہے کہ انسانی جذبات مثلاً خوشی، غم، محبت، نفرت، غصہ کا تعلق دراصل دل سے ہوتا ہے جس کے دل میں نیک جذبات ہوں، وہ برا بننا بھی چاہے تو نہیں بن سکتا، اس کے اندر کی اچھائی اسے برائی سے روکتی ہے جسے ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"اوہ ــ یہ تو آپ بہت خوفناک بات بتا رہے ہیں ــ اس طرح تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ میرا دماغ مجھے کچھ کرنے کو کہے گا اور دل کچھ ــ اف یہ آپ نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا۔" پروفیسر پریشان ہوکر بولا۔

"آپ پریشان نہ ہوں پروفیسر ــ ضروری نہیں کہ یہ بات درست ہو کہ جن سائنس دانوں نے یہ تحقیق کی ہے وہ ابھی اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے۔"

مگر میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے تو لگتا ہے کہ ان کی تحقیق درست ہے۔" پروفیسر بولا۔

"ہوں ــ ان سائنسدانوں میں سے ایک سے میری واقفیت ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ اس سے مل کر آپ کا معاملہ ڈسکس کرتا ہوں۔ شاید ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔ اس دوران آپ بے فکر ہو کر اپنا کام کریں اور خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کریں کہ آپ پروفیسر ڈک ہیں پھر یہ سوچیں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن ابھی اس بات کہ اپنے

تک ہی رکھیے گا۔ صدر صاحب وغیرہ کو ابھی بتانا مناسب نہیں۔" پروفیسر بولا۔ اور ڈاکٹر نے سر ہلا دیا۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

کمرے کا دروازہ بند کر کے پروفیسر سونے کے لئے لیٹ گیا۔

"سارا کام مکمل ہو چکا ہے۔ کل تجربہ کروں گا اور امید ہے کہ بم ڈیزائن ہو جائے گا۔" وہ سوچ رہا تھا۔

"ذرا سوچو انسانیت کی تباہی کے لئے کام کر کے تمہیں کیا ملے گا؟ تم ایک اچھے انسان ہو۔ اپنی ذہانت کو تعمیری کاموں میں استعمال کر سکتے ہو۔ ایسی ایجادیں کر سکتے ہو جن سے ساری انسانیت کو فائدہ پہنچے۔" اس کا دل بول رہا تھا۔

"نہیں۔ میں بھلا ایسا کیوں کروں۔ میں پروفیسر ڈک ہوں۔ مسلمانوں کا دشمن۔ مجھے بچپن سے یہی تعلیم دی گئی ہے کہ مسلمان ہمارے دشمن ہیں۔ میں۔ میں بم ضرور بناؤں گا۔" اس کے دماغ میں سختی آ گئی۔

"نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔ تم برے نہیں ہو۔ تمہیں برا بنایا گیا ہے۔ یہ لوگ تم سے اپنے مفاد میں کام کروا رہے ہیں۔ یہ لوگ ساری دنیا کے دشمن ہیں۔ ان کی وجہ سے دنیا میں اسلحے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اگر یہ چند ملک اسلحہ نہ بنائیں تو چھوٹے ملکوں کو بھی ایسا نہ کرنا پڑے۔ ذرا سوچو جتنی دولت اسلحے پر خرچ کی جاتی ہے۔ اگر لوگوں کی فلاح کے لئے خرچ کی جائے تو دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔ ہر طرف خوشحالی آ جائے۔" دل نے اسے سمجھایا۔

"اف۔ تم مجھے پاگل کر دو گے۔ میں پھر کہتا ہوں۔ میں پروفیسر ڈک ہوں۔ میرا انسانیت اور محبت سے کوئی واسطہ نہیں۔" آخر وہ چلا اٹھا۔

"تمہیں اپنی سوچ بدلنا ہوگی۔ سوچ بدل سکتی ہے۔ خیال بدل سکتے ہیں۔ مگر جذبات و احساسات نہیں بدلتے تمہارا دل ایک نیک انسان کا دل ہے جس میں نیک جذبات ہیں اور جذبے کبھی نہیں مرتے۔ انسان مر جاتا ہے۔ اس کی سوچ مر جاتی ہے۔ سوچیں تو وقتی ہوتی ہیں مگر جذبے وقتی نہیں ہوتے۔ انسان اپنے جذبات پر کتنا ہی پہرہ کیوں نہ بٹھا دے وہ کہیں نہ کہیں سے راستہ بنا ہی لیتے ہیں۔" دل نے پر زور انداز میں دلائل دیئے۔

"مم۔ مگر۔ یہ دل میرا تو نہیں۔ یہ جذبے میرے تو نہیں۔ میں۔ میں تو پروفیسر ڈک ہوں میں تمہارا کہا کیوں مانوں؟ میں صرف دماغ کی بات مانوں گا۔ میں بم ضرور بناؤں گا۔ ضرور۔" پروفیسر بے چارگی کے عالم میں بولا۔

پروفیسر۔ تم نے ایک زندگی کا خاتمہ کیا ہے۔ اس کے جسم پر قبضہ کیا ہے۔ اب اس کے جذبے ہی تمہارے جذبے ہیں۔ پروفیسر اگر تم ان جذبوں کو قبول نہیں کرتے تو اس جسم کو بھی قبول نہ کرو واپس کر دو۔ جس کا ہے اسے واپس کر دو

— اس جسم پر تمہارے جیسے مکروہ شخص کا کوئی حق نہیں — اس جسم کی پرورش رزق حلال سے ہوئی ہے۔ اس دل کو صرف محبت کرنا سکھایا گیا ہے۔ یہ دل صرف انسانیت کے دشمنوں سے نفرت کرتا ہے۔ اگر تمہیں اس کے جذبے قبول نہیں تو اپنا دماغ واپس نکال لو — تم نیک بن ہی نہیں سکتے — اگر تم شیطانی سوچوں کے مالک ہی رہنا چاہتے ہو تو اس دل کو، اس جسم کو رسوا نہ کرو — ان جذبوں کی تذلیل نہ کرو — پروفیسر یہ جسم لوٹا دو۔"

پروفیسر نے ایک دم گھبرا کر اپنا سر تھام لیا۔ اس کا سانس پھول چکا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ میلوں کی دوڑ لگا کر آیا ہے۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ صدر نے ریسیور اٹھایا اور بیزاری کے عالم میں بولا، "ہیلو — یہ اتنی صبح صبح کون ہے — اوہ — یہ آپ ہیں پروفیسر ڈک — کہیے آپ کا تجربہ کہاں تک پہنچا؟"

"یہی بتانے کے لئے تو فون کیا ہے۔ میرا کام مکمل ہو چکا ہے۔ میں ابھی ایٹمی پلانٹ جا رہا ہوں بس ایک آخری تجربہ کرنا ہے پھر آپ خوشخبری سنیں گے۔" پروفیسر ڈک نے کہا۔

"واہ — اس خوشخبری کا تو میں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ پروفیسر آپ فوراً روانہ ہو جائیں۔ صدر نے بھی ریسیور رکھ دیا اور اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ سارا دن وہ پروفیسر کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا جب وہ ایوان صدر کے ایک کمرے میں بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا کہ دوڑتے قدموں کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا۔

"خیر تو ہے؟" اس نے دوڑ کر اندر آنے والے سے پوچھا۔ وہ صدر کا سیکریٹری تھا۔

"سس — سر بہت بری خبر ہے۔" وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"بری خبر!؟" صدر چونک اٹھا — جلدی بتاؤ کیا بات ہے؟"

"سر — وہ — وہ — ایٹمی پلانٹ تباہ ہو گیا ہے۔" سیکریٹری نے لرزتی آواز میں بتایا۔

"کیا!!" صدر بھیانک آواز میں چلا اٹھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ فائل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔

"یہ — یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ صبح ہی تو مجھے پروفیسر ڈک کا فون ملا تھا۔ وہ کسی تجربے کے لئے ایٹمی پلانٹ جا رہا تھا۔ اور — اور — اف — یہ کیسے ہو سکتا ہے وہاں تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ یہ کیسے ہوا؟ تخریب کاری ہوئی ہے یا حادثہ؟" صدر کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔

"سر، ہمیں کچھ نہیں پتہ کہ یہ کیسے ہوا؟ یہ ایٹمی پلانٹ تو بے حد محفوظ تھا تخریب کاری کا تو سوال ہی نہیں اور حادثے کے متعلق بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر یہ ان باتوں کا وقت نہیں پلانٹ تو تباہ ہو چکا اور پروفیسر ڈک سمیت سارے سائنسدان بھی مارے گئے۔ اب ہمیں فوراً یہاں

سے دور جانا ہے یہ شہر پلانٹ سے زیادہ دور نہیں جلد ہی یہ تابکاری کی زد میں آجائے گا۔" سیکریٹری جلدی جلدی بولا۔

"اف — مجھے یقین نہیں آرہا — سیکریٹری — یہ تو ہمارے ملک کا سب سے بڑا اور اہم ایٹمی پلانٹ تھا اور ملک کے چوٹی کے سائنسدان وہاں کام کررہے تھے۔ ہم — ہم تباہ ہوگئے ہیں — برباد ہوگئے ہیں — ہمارا ورلڈ آرڈر کا خواب اب کیسے پورا ہوگا — یہ — یہ — سب کیا ہوگیا — مم — میرا — دل ڈوب رہا ہے — مم — میں — میں —" صدر کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ تیورا کر گر پڑا۔ سیکریٹری جلدی سے اسے اٹھانے کو لپکا۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

ڈاکٹر اس وقت ایک سائنسدان کے پاس بیٹھا پروفیسر ڈک کا کیس ڈسکس کررہا تھا جب اس نے یہ خبر سنی — وہ سکتے میں آگیا۔

"مم — میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہوجائے گا — یہ — یہ پلانٹ یقیناً پروفیسر ڈک نے خود تباہ کردیا ہے۔ اف میرے خدا — پروفیسر کے دل اور دماغ میں جو جنگ ہورہی تھی۔ اس میں دل جیت گیا۔ جذبے جیت گئے۔" ڈاکٹر کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

مسلمان قیدی نے مر کر بھی اپنا مشن پورا کردیا تھا۔

*

اسلامی نظریہ

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام جارہے تھے راستے میں اطلاع ملی کہ شام میں طاعون پھیلی ہوئی ہے وہاں جانا مناسب نہیں یہ سن کر حضرت عمرؓ نے مہاجرین سے رائے پوچھی ان کی رائے مختلف تھیں کچھ نے کہا شام جانا چاہئے کچھ نے کہا نہیں جانا چاہئے۔ اسی طرح انصار نے جواب دیا آخر اکابرین امت نے رائے دی کہ واپس جانا چاہئے حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ صبح واپس جائیں گے اس پر ایک صحابی بولے کہ "عمرؓ آپ تقدیر سے بھاگ رہے ہیں۔" حضرت عمرؓ نے مدلل جواب دیا۔ "ہم تقدیر سے تقدیر الٰہی کی طرف بھاگ رہے ہیں بتاؤ اگر دو میدان ہوں ایک ہرا بھرا اور دوسرا خشک اب تم اونٹ جس میدان میں بھی چراؤ گے یہ تقدیر الٰہی سے ہوگا۔ ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ آگئے وہ کسی کام سے گئے تھے وہ کہنے لگے مجھے اس مسئلہ کا پتہ ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر تم کو معلوم ہو جائے کسی ملک میں طاعون کی وبا پھیلی ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر اس ملک میں وبا پھیل جائے جہاں تم موجود ہو تو وہاں سے کہیں نہ جاؤ۔

چودہ سو سال پہلے رحمتہ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول بنایا وہی آج کل عالمی ادارہ صحت بنا رہا ہے۔ بہرحال طاعون ایک خطرناک بیماری ہے اور اس سے بچنا چاہئے لڑے بھائی اور کیسے پاک صاف رہیں اور اپنے ماحول کو بھی پاک صاف رکھیں۔ شکریہ!

مرسلہ: ممتاز حبیب صابر، مردان

راستہ تلاش کیجیے

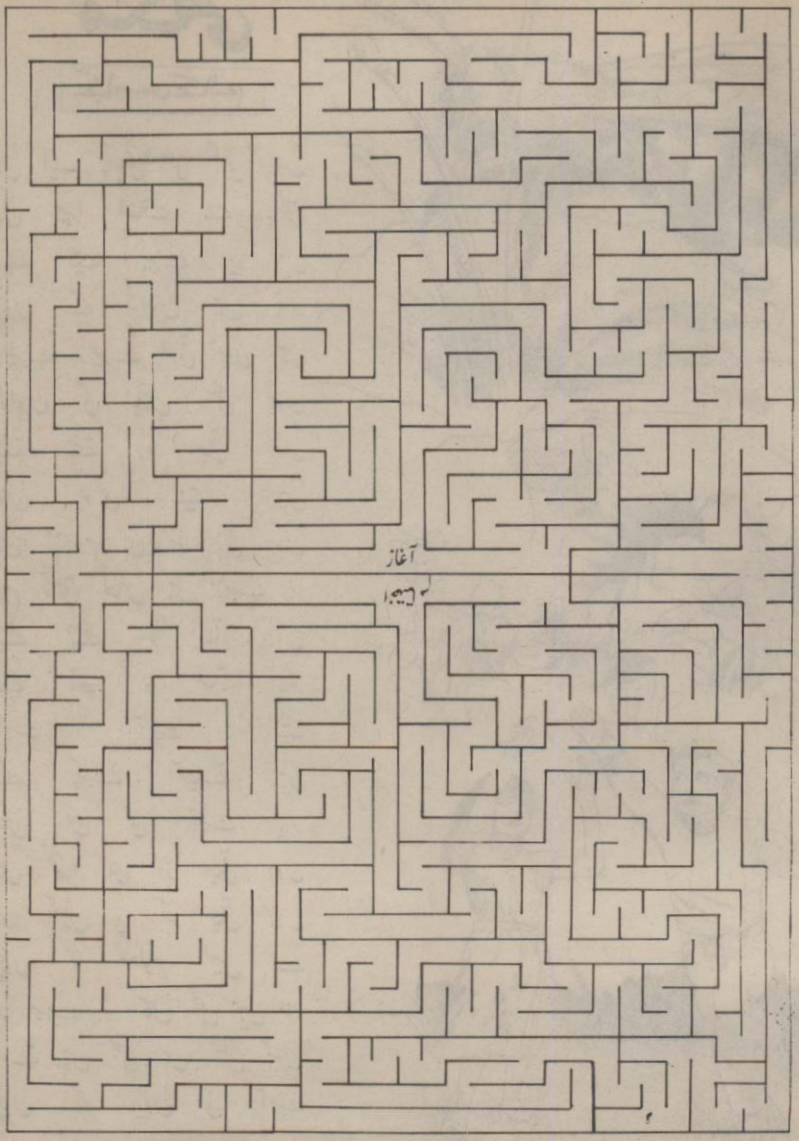

مکھی

عبّاس عالم

میں ایک چھوٹی سی مکھی ہوں
دل میرا شفاف ہے بالکل
ایسے جیسے میرے پر ہیں
بچوں کے خوابوں میں آکر
دھیرے دھیرے اڑتی ہوں میں
خوابوں کی باتیں سنتی ہوں
ہنستے ہنستے رو جاتی ہوں
لیکن جونہی بچے دیکھیں
میں معصوم سی ہو جاتی ہوں
نرم چمکتی گھاس میں چھپ کر
بیٹھے بیٹھے سو جاتی ہوں
بچے مجھ کو سوتا پا کر
آہستہ آہستہ چلتے
مجھے پکڑنے آجاتے ہیں
لیکن ان کی آہٹ پا کر
میں فوراً ہی اڑ جاتی ہوں
دور کہیں پر کھو جاتی ہوں
بچوں کو معلوم نہیں ہے
کہ میرے دو کان بھی ہیں اور
سوتے میں بھی سن سکتی ہوں
بچوں کے پیروں کی آہٹ

اور قلعہ سر ہو گیا

عبدالستار جنان طاہر

محاصرے کو بڑا لمبا عرصہ گزر گیا تھا مگر سلطان غیاث الدین بلبن کو قلعہ سر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا وہ بہت پریشان تھا۔ اسے قلعہ توڑنے کی کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی۔ موسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ ایک شام ایسا تیز و تند طوفان باد و باراں آیا کہ ساری فوج کے خیمے اڑ گئے۔ امرا اور سالاروں کے خیمے بھی محفوظ نہ رہے۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا اور آگ بھی محفوظ نہ رہی۔ سحر کا وقت تھا۔ شاہی سقہ (ماشکی) کے ذمے یہ فرض تھا کہ سحر کی تاریکی میں سلطان بلبن کے وضو کے لئے پانی گرم کرے مگر ایسی طوفانی رات میں آگ کا نشان نہ رہا۔ خیمہ گاہ جو دشمن کے قلعے کے ارد گرد تھی۔ جل تھل ہو گئی تھی۔ سقہ آگ کی تلاش میں نکلا قلعے کے گرد گھوم گیا۔ کہیں آگ نظر نہ آئی۔ دور اسے ایک لو ٹمٹماتی دکھائی دی۔ وہ ادھر کو دوڑا۔ یہ کسی کا خیمہ تھا۔ اس میں چراغ جل رہا تھا اور ایک درویش صورت بزرگ تلاوت کلام پاک میں محو تھے۔ ان کی آواز کے سوز، ان کے چہرے مہرے کے جلال اور قرآن پاک کے مقدس الفاظ نے سقہ پر سحر طاری کر دیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ کس کام سے آیا تھا۔ درویش نے ادھر دیکھا۔ "آؤ بھائی۔" انہوں نے سقہ سے کہا۔ "باہر سردی ہے اندر آ جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم چراغ کی روشنی پر آئے ہو۔ ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ جلتے ہیں۔ آگ لینے آئے ہو۔ لے جاؤ۔" سقہ دم بخود ہو کے رہ گیا۔ اس نے خشک لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھا رکھا تھا۔ درویش کے کہنے پر اس نے چراغ سے لکڑی جلائی اور واپس جا کر سلطان غیاث الدین بلبن

کے وضو کے لئے پانی گرم کیا۔ پانی سلطان کو دے کر درویش کے خیمے کی طرف دوڑ پڑا مگر خیمے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ مایوس لوٹ رہا تھا کہ اسے ایک تالاب کے کنارے وہی درویش وضو کرتے نظر آئے۔ سقہ ان کے قریب جا کھڑا ہوا اور بولا۔

"آپ اتنے ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہے ہیں۔ میں گرم پانی لا سکتا ہوں۔" درویش نے اسے کہا کہ وہ اس جگہ کے پانی کو ہاتھ لگائے جہاں وہ وضو کر رہے تھے۔ سقہ نے ہاتھ لگایا تو وہاں پانی گرم پایا۔ ایک اور جگہ تالاب میں ہاتھ ڈالا تو پانی یخ تھا۔ سقہ حیران بھی ہوا اور مرعوب بھی۔ اگلی صبح وہ پھر تالاب کے کنارے گیا۔ پانی کو یخ پایا لیکن درویش بزرگ وضو کرنے آئے تو اس جگہ پانی کی سردی ختم ہو چکی تھی جہاں انہوں نے وضو کیا تھا۔ سقہ نے سلطان غیاث الدین بلبن کو یہ واقعہ سنایا تو سلطان گہری سوچ میں کھو گیا، پھر بولا۔ کل اسی وقت مجھے ساتھ لے چلنا۔" اگلی صبح سقہ سلطان کو ساتھ لے گیا۔ سلطان نے بھی دیکھا کہ جہاں درویش نے وضو کیا ہے وہاں پانی گرم ہے۔ درویش نے وضو کیا اور اپنے خیمے میں چلے گئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی ان کے خیمے میں گیا۔ درویش نے نماز سے فارغ ہو کر تلاوت شروع کی تو سلطان بلبن نے ان کے پاؤں پکڑ لئے اور ان کی کرامات کا ذکر کئے بغیر کہا۔ "اے خدا کے برگزیدہ بزرگ! ایک مدت سے یہ قلعہ سر نہیں ہو رہا۔ دعا کیجئے میں دشمن کو شکست دے سکوں۔" درویش نے قرآن پاک بند کیا اور بولے۔ "اگر تو قلعہ اس لئے سر کرنا چاہتا ہے کہ تیرا دشمن بھی تیری سلطانی کو تسلیم کرے تو تجھ سے یہ قلعہ کبھی سر نہ ہو گا۔ اور اگر تو دشمن کے دل میں خدائے عزوجل کی سلطانی قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو جا قلعہ تیرا ہے۔ ایک بات اور دل میں بٹھا لے۔ دشمن کے قلعے سر کرنے سے پہلے اپنے نفس کے محاصرے سے نکل۔ تیری ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ تو اپنے نفس کے محاصرے میں ہے جو خود اپنے نفس کے محاصرے میں ہو وہ کسی اور کو محاصرے میں لے کر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تو دنیا کی آگ سے پانی گرم کرواتا ہے اور ٹھنڈے پانی سے وضو نہیں کر سکتا۔ سینے میں ایمان کی حرارت ہو تو برف بھی پگھل کر تجھے گرم پانی مہیا کرے گی۔ تیرا نوکر تیرا پانی گرم کرنے کے لئے آگ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے تو اپنے سینے میں آگ کیوں نہیں جلاتا؟..... جا، ایمان کی حرارت سے حملہ کر۔ خدا تیری مدد کرے گا۔" دو دنوں میں سلطان غیاث الدین بلبن نے قلعہ سر کر لیا۔ وہ درویش کے خیمے میں گیا مگر وہ جا چکے تھے۔ بہرحال اسے پتہ چل گیا کہ وہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک" تھے جو یاد الٰہی کے لئے ویرانے میں نکل آئے تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن ان کے آستانے میں حاضر ہوا اور مرتے دم تک ان کا مرید رہا۔ یہ واقعہ خواجہ شمس الدین ترک" کی مشہور کتاب "سیر الاقطاب" میں روایت کیا گیا ہے۔

بے چارے

منیر احمد راشد

اگر کسی کو میٹھی عید پر کڑوی دوا پینی پڑے تو وہ بُرے بُرے منہ نہ بنائے گا تو اور کیا کرے گا...... نوید بھی اس وقت کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔ تقریباً ایک ماہ پہلے وہ بیمار ہوا تھا۔ بس یونہی بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت مول لے لی تھی۔ جمعے کا دن تھا اور شام کا وقت کہ اچانک گڑیا نے فرمائش کر دی کہ وہ چاٹ کھائے گی۔ چاٹ نوید اور گڑیا، دونوں بہن بھائیوں کا من بھاتا کھاجا تھی۔ ان کا بس چلتا تو صبح دوپہر شام، تینوں وقت صرف چاٹ پر گزارا کرتے۔ مگر یہ بات یوں ممکن نہیں تھی کہ گھر میں ان کے علاوہ امی ابو بھی تھے جو صرف چاٹ کھا کر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس

لئے گھر میں دوسرے کھانے بھی پکا کرتے تھے۔ بلکہ اکثر دوسرے ہی کھانے پکا کرتے تھے۔ چاٹ تو کبھی کبھار ہی بنتی تھی۔ وہ بھی ان دونوں کی بے انتہا ضد پر یوں تو چاٹ کوئی ایسی نایاب شے نہیں تھی کہ جس کی خاطر سو جتن کرنے پڑتے۔ گھر سے اسکول تک جاتے ہوئے چاٹ کی دو دکانیں اور تین ٹھیلے پڑتے تھے۔ اور ان کی جیبوں میں اتنے پیسے بھی ہر وقت ہی ہوتے تھے کہ وہ چاٹ خرید کر کھا سکتے۔ مگر اپنے تمام تر چٹورے پن کے باوجود وہ بازار سے چیزیں خرید کر نہیں کھاتے تھے۔ انہیں امی ابو نے منع جو کر رکھا تھا۔ نوید آٹھویں اور گڑیا پانچویں میں پڑھتی تھی۔ دونوں اتنے سمجھ دار اور اچھے بچے تھے کہ کبھی امی ابو کا کہنا نہیں ٹالتے تھے۔ لیکن اس شام نہ جانے کیا ہوا۔ دونوں گھر میں اکیلے تھے کہ گڑیا کو چاٹ کی ہڑک اٹھی۔ اور اس نے اتنی ضد کی کہ نوید بھی مجبور ہو گیا۔ وہ گھر سے نکلا۔ گلی کی نکڑ پر واقع "مستانہ چاٹ کارنر" سے دو پلیٹ تیز مسالے کی چاٹ خریدی اور ٹیکتی رال کو سنبھالتا ہوا گھر کی طرف بھاگا۔ دو پلیٹ چاٹ صرف دو منٹ کی مار تھی۔ دونوں سی سی کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ دل میں ذرا شرمندہ بھی تھے کہ آج امی ابو کی حکم عدولی کر بیٹھے ہیں۔ لیکن دونوں ہی مجرم تھے اس لئے اطمینان تھا کہ کوئی کسی کی شکایت نہیں کرے گا۔

چاٹ کھانے کے بعد سی سی اور سوں سوں کم کرنے کے لئے دونوں نے ٹھنڈے پانی کے دو دو گلاس پیئے۔ اور دوبارہ اپنے کاموں میں مگن ہو گئے۔ گڑیا صحن میں اپنی گڑیا سے کھیلنے لگی۔ نوید نے ڈرائنگ روم میں آ کر ٹی وی آن کر لیا اور کارٹون فلم دیکھنے لگا۔ نینجا ٹرٹلز پیزا کھانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ان کے دیرینہ دشمن نے ان کے دوست سیارے پر حملہ کر دیا۔ ادھر پیٹ کے درد نے نوید پر حملہ کیا۔ گڑگڑ کی آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ نوید کو یوں لگا جیسے دشمن روبوٹ کے پیٹ میں نصب اسکرین میں نہیں بلکہ خود اس کے پیٹ میں بول رہا ہے۔ ادھر سیارے کے بادشاہ اور ملکہ نے نینجا ٹرٹلز کو مدد کے لئے پکارا۔ اس طرف نوید نے گڑیا کو آواز دی۔ نینجا ٹرٹلز اور گڑیا ایک ہی وقت کمرے میں نمودار ہوئے۔

"کیا ہوا بھیا؟" گڑیا نے گھبراہٹ سے پوچھا۔

"میرے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے..... کچھ کرو..... دیکھو امی کی دراز میں بسکوپان پڑی ہوگی..... جلدی لاؤ..... اور پانی بھی۔" نوید نے کراہتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔ گڑیا فوراً امی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ نوید کی طبیعت لحہ بہ لحہ خراب ہو رہی تھی۔ وہ ٹی وی اور ٹرٹل کو بھول چکا تھا۔ اور درد کے مارے بل کھا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کی آنتوں کو مروڑ رہا ہو۔ یا یوں جیسے اس کے پیٹ میں پتھر ہوں جو

آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ درد کسی بے چین اور شریر بچے کی طرح پورے پیٹ میں دوڑا پھر رہا تھا۔ کبھی نیچے کی طرف، کبھی پیچھے کی طرف، کبھی یوں لگتا جیسے سر کی طرف چڑھ آیا ہو۔ اور کبھی کبھی تو پورے کا پورا بدن ہی دکھتا ہوا محسوس ہوتا۔ سینے پر عجیب سا بوجھ تھا دل گھبرا رہا تھا۔ متلی کا سا احساس ہو رہا تھا..... اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی..... تھوڑی تھوڑی دیر میں پورا منہ کھول کر لمبا سا سانس لینا پڑتا..... وہ صوفے سے اٹھ کر قالین پر آ گیا تھا۔ اور پیٹ دبا گھٹنوں کے بل اوندھا لیٹا تھا..... گڑیا کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔

"جانے کہاں مر گئی۔" اس نے غصے سے سوچا۔ "ایک تو اسے کوئی چیز ملتی ہی نہیں..... پھوہڑ کہیں کی..... کام کے وقت تو بالکل اندھی ہو جاتی ہے ..... سامنے کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں ..... گڑیا!!!" وہ زور سے چیخا۔

"جی بھیا..... آئی..... مل گئی بسکو پان ..... پانی بھی لا رہی ہوں۔" گڑیا نے وہیں سے ساری رپورٹ دی۔ مگر گڑیا کے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی اطلاعی گھنٹی بجی اور گڑیا سب کچھ چھوڑ چھاڑ "امی آ گئیں..... امی آ گئیں۔" کہتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے پر امی ابو ہی تھے۔ گڑیا نے جلدی جلدی بھیا کے طبیعت کی خرابی کی اطلاع دی۔ "ہائے میرا لعل۔" امی نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا اور تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف لپکیں۔ ابو اور گڑیا بھی ان کے پیچھے تھے۔

ڈرائنگ روم میں نوید نے امی کی آواز سن لی تھی۔ اسے اپنا درد ناقابل برداشت محسوس ہونے لگا۔ امی کی موجودگی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور جب امی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا میرے لعل کو؟" تو نوید پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ابو کی مدد سے امی نے اسے اٹھا کر صوفے پر لٹایا اور گڑیا سے پانی کا گلاس لے کر اس کے منہ میں لگا دیا۔

"آپ ڈاکٹر کو فون کیجئے پلیز....." امی نے خالی گلاس دوبارہ گڑیا کو تھماتے ہوئے ابو سے کہا۔ اور نوید کا سر گود میں رکھ کر سہلانے لگیں۔ وہ مسلسل نوید سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ نوید درد کی شدت سے بے چین تھا اور "ہائے امی جی..... ہائے امی میرا پیٹ۔" کے علاوہ اس کے منہ سے کوئی بات نکل ہی نہیں رہی تھی۔ ابو فون کر کے لوٹے اور بتایا کہ ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی نوید کو ایک لمبی سے الٹی آئی..... چٹپٹی چاٹ، بدبو دار مواد کی صورت میں منہ اور ناک کے راستے جسم سے نکلی اور صوفے اور قالین کو خراب کر گئی۔ امی کی قمیض کا دامن بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ نوید کو سینے، حلق اور ناک، آنکھوں اور کانوں میں مرچیں سی لگتی محسوس ہو رہی تھیں۔ قے کے پانچ دور اور ہوئے۔ مگر ان میں صرف کڑوا اور مرچوں والا پانی بر آمد ہوا مرچوں کی جلن نے نوید کو

کھانسی اور چھینکوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ امی جان بار بار تولیہ سے اس کا منہ اور اپنی قمیص صاف کر رہی تھیں۔ ابو نوید کی کمر سہلا رہے تھے اور گڑیا الگ کھڑی آنسو بہا رہی تھی..... وہ دل ہی دل میں اللہ میاں سے دعا بھی کر رہی تھی کہ وہ نوید بھیا کو ٹھیک کر دے۔ اس نے توبہ مانگی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ آئندہ کبھی ضد نہیں کرے گی اور امی ابو کا کہنا ہمیشہ مانے گی۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ نوید قے کے بعد خود کو کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے شرمندہ سے لہجے میں خود ہی سب کچھ ڈاکٹر کو بتا دیا۔ امی ابو سے معافی بھی مانگی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ چاٹ کھانے کی ضد گڑیا نے کی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ چغلی کھانا بری بات ہے۔ یوں بھی اسے اپنی بہن سے بہت محبت تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے ڈانٹ پڑے۔

ڈاکٹر دوا دے کر اور نصیحتیں کر کے چلے گئے۔ نوید نے دوا کھائی مگر وہ بھی الٹی میں نکل گئی۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے معدے نے کسی بھی شے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کھانا کھاتا، پانی پیتا یا دوا کھاتا، فوراً پیٹ میں درد شروع ہوتا اور قے ہو جاتی۔ پیٹ خالی ہونے کے بعد نوید کو اپنی طبیعت بہتر محسوس ہوتی۔ کھائے پیئے بغیر انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ نوید بھی روز بروز کمزور ہونے لگا۔ امی ابو کو سخت فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے کئی ڈاکٹروں، ہومیو پیتھ، اور حکیموں کو دکھایا، دوائیں بدلیں مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ وہ پریشان رہنے لگیں۔ نمازیں پڑھ پڑھ کر اللہ سے دعائیں مانگیں۔ منتیں مانیں..... تب کہیں جا کر ایک حکیم کا علاج موافق آیا۔ وہ بھی اتنا کہ ہر وقت کی الٹیاں رک گئیں۔ کچھ نہ کچھ ہضم ہونے لگا۔ حکیم صاحب نے بہت سخت پرہیز بتایا تھا۔ نوید صرف سوپ پی سکتا تھا یا پھر بہت ہی ہلکی اور جلد ہضم ہونے والی غذا کھا سکتا تھا۔ پرہیز سے زیادہ مشکل مرحلہ دوا پینے کا تھا بہت بد مزہ اور کڑوی دوا تھی۔ اس کا ایک گھونٹ حلق سے اتارنا ہی نوید کے لئے کسی مصیبت سے کم نہیں تھا جبکہ حکیم نے اسے کئی ہفتے جاری رکھنے کا حکم سنایا تھا۔ وہ دن تھا اور آج کا دن..... تقریباً ایک ماہ سے نوید یہ کڑوی دوا پی رہا تھا۔

ابو نے نئے کپڑے پہن لئے تھے۔ نوید تو پہلے سے تیار تھا۔ گڑیا محلے کے گھروں میں سویاں دینے گئی ہوئی تھی اور امی جان باورچی خانے میں عید کے پکوان پکا رہی تھیں۔ ابو نے نوید کو نماز کے لئے بلایا اور دونوں عید گاہ کی طرف چل دیئے۔

عید گاہ میں لوگ مسکراتے چہروں اور رنگ برنگے کپڑوں کے ساتھ موجود تھے۔ کچھ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے کچھ مولوی صاحب کی تقریر سن رہے تھے۔ کچھ بیٹھے تھے۔ کچھ کھڑے اور کچھ ابھی آ رہے تھے۔ سبھی خوش تھے۔ عید گاہ میں گویا خوشیوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ نوید کو پچھلی عید یاد آنے لگی جب وہ اپنے دوستوں کے

ساتھ کلفٹن گیا تھا۔ وہاں وہ لوگ خوب گھومے تھے۔ کھیلے کودے، جھولے جھولے، مزے مزے کی چیزیں کھائیں..... اللہ کتنا مزا آیا تھا پچھلی عید کو یاد کر کے نوید کا دل خوش ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج شام کو بھی کلفٹن ضرور جائے گا۔

شام کو حسب روایت نوید کے دوست ایک کار میں سوار، اس کے گھر پہنچے۔ نوید ابو سے پہلے ہی اجازت لے چکا تھا۔ اور اجازت اس شرط پر ملی تھی کہ وہ کلفٹن پر کچھ الّا بلّا نہیں کھائے گا۔ پانچوں دوست باتیں کرتے، ہنستے بولتے، ساحل سمندر کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کی باتوں سے نوید کو اندازہ ہوا کہ وہ آج بہت زیادہ خوش کیوں ہیں۔ اکرم نے بتایا کے اس بار ان چاروں نے پورے روزے رکھے تھے اور پورے اہتمام کے ساتھ رکھے تھے۔ پانچوں وقت کی نمازیں با جماعت ادا کیں۔ تین تین بار قرآن مجید ختم کیا۔ اپنی حد تک ہر قسم کے فضول کاموں سے بچے رہے۔ نہ ڈبو کھیلا، نہ کیرم، نہ ویڈیو دیکھا نہ فلم۔ حتیٰ کے فیروز نے تو سونی آرٹ سرکل سے پورے مہینے کی چھٹی لے لی تھی۔ فیروز وہاں گٹار کی باقاعدہ تربیت لے رہا تھا۔ اس نے اپنے کمر تک آئے ہوئے چمپتے بال بھی کٹوا دیئے تھے۔ نوید ان سب کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ اسے دکھ ہوا کہ وہ اس بار ایک بھی روزہ نہیں رکھ سکا تھا۔ کیونکہ اس کا تو علاج چل رہا تھا۔ "خیر..... اگلے سال سہی۔" اس نے اپنی دل کو تسلی دی اور دوستوں کے ساتھ باتوں میں مگن ہو گیا۔

ساحل پر پہنچ کر انہوں نے کپڑے بدلے۔ فٹ بال اٹھایا اور سیدھے سمندر کے پانی میں اتر گئے۔ وہ لوگ پانی میں ہاتھوں کی مدد سے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ کافی دیر بعد ان کی تفریح کا دوسرا آئٹم شروع ہوا۔ فیروز نے اپنا گٹار اٹھایا اور بجانا شروع کر دیا۔ باقی تینوں گٹار کی لے پر تھرک رہے تھے۔ کچھ اور لڑکے بھی ان کے گرد جمع ہو گئے جسے ناچنا نہیں بھی آتا تھا وہ بے ہنگم انداز میں مٹک رہا تھا۔ اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ لوگ تالیاں پیٹ رہے تھے تھوڑی دیر میں یہ محفل موسیقی اچھا خاصا طوفان بد تمیزی بن گئی اور فیروز نے گٹار بجانا بند کر دیا۔ وہ پانچوں مجمع سے نکل کر ایک پر سکون جگہ پر آ گئے۔ بھاگ دوڑ، اچھل کود اور ناچ گانے کی وجہ سے ان پر تھکن طاری ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنا سامان سمیٹ کر گاڑی میں رکھا کیسٹ پلیئر پر انڈین گانے بجاتے ہوئے اور گھر سے لائے ہوئے سینڈوچ، سموسیاں، چھولے، اور چاٹ نکال کر کھانے لگے۔ انہوں نے نوید کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی۔ مگر نوید نے انکار کر دیا۔ وہ ابو کے ساتھ کیا ہوا وعدہ توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دوستوں نے اصرار کیا۔ دلائل دیئے۔ اکرم نے کہا کہ "ابو نے الّا بلّا کھانے سے منع کیا ہے۔ یہ سب سامان تو ہم لوگ اپنے گھروں سے بنوا کر لائے ہیں یہ بازاری کھانا تو نہیں ہے۔" یہ بات نوید کے دل کو لگی اس نے ڈرتے ڈرتے تھوڑی سی

چاٹ کھالی۔ بہت مزے کی چاٹ تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اور کھائے مگر اس نے زبردستی اپنا ہاتھ روکے رکھا۔ اب یہ اس کا خوف تھا یا ابو سے کیا ہوا وعدہ توڑنے کی سزا کہ اس کے پیٹ میں وہی پرانا درد شروع ہو گیا۔ نوید نے اپنا ذہن ادھر ادھر بھٹکا کر درد کو بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ درد میں اضافہ ہو رہا تھا وہ ایک مہینے پہلے والا درد ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ نوید جانتا تھا کہ جب تک چاٹ پیٹ میں ہے درد ہوتا رہے گا۔ ہوتا رہے گا اور بڑھتا رہے گا۔

اس نے جلدی سے اپنے حلق میں انگلی ماری اور قے کر دی۔ یوں اسے کچھ سکون ملا۔ دوستوں نے دکھ اور ہمدردی کے جذبے کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ فیروز بولا۔

"بے چارہ..... کیسی عجیب بیماری لگی ہے اسے ..... جو بھی کھاتا ہے اگل دیتا ہے ایک مہینے کے علاج نے کچھ بھی تو فائدہ نہیں پہنچایا اسے۔"

وہ افسوس کر رہے تھے

مگر کتنے افسوس کی بات تھی کہ نوید کو بے چارہ کہنے والوں کو اپنی بے چارگی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رمضان کے پورے روزے پورے اہتمام کے ساتھ رکھ کر انہوں نے اپنی روح کو ایمان کی جو غذا پہنچائی تھی۔ ابھی چند لمحے پہلے وہ اسے ساحل سمندر پر اگل چکے تھے وہ بے چارے اپنے کئے سے غافل تھے اور وہاں ان کی بے چارگی پر افسوس کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

نصیحت

ایک دفعہ سلیمان بن عبدالملک مدینہ منورہ تشریف لائے اور پوچھا مدینہ منورہ میں کوئی ایسی شخصیت ہے جس نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اقدس پائی ہو؟ لوگوں نے کہا کہ ابو حازمؒ ہے۔ سلیمان نے اس کی خدمت میں ایک قاصد بھیجا۔ جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے استفسار کیا کہ اے ابو حازمؒ! ہم موت سے کیوں بوکھلاتے ہیں؟ تو ابو حازمؒ نے فرمایا اس لئے کہ تم لوگوں نے اپنا آخرت ڈھا دیا ہے اور اپنی دنیا آباد کی ہے لہٰذا آپ آبادی سے ویرانے کی طرف کوچ قابل نفرت سمجھتے ہیں۔ سلیمان نے پھر سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری پیشی کیسے رہے گی؟ ابو حازمؒ نے جواب دیا کہ محسن اس گمشدہ آدمی کی طرح ہے جو اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ آئے اور گنہگار اس بھگوڑے غلام کی طرح ہے جو آقا کے روبرو پیش کیا جائے۔ اس کے بعد سلیمان بہت رویا اور کہا کہ اے کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ اللہ کے دربار میں میرا مرتبہ کیا ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ اپنے اعمال کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھ لو۔ تو سلیمان نے پوچھا کہ میں یہ کسوٹی کس مقام پر پاؤں گا؟ ابو حازمؒ نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں کہ ترجمہ..... (بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہونگے اور تحقیق بدکار لوگ جہنم میں ہونگے) سلیمان نے پھر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے؟ تو ابو حازمؒ نے فرمایا ترجمہ..... (نیک لوگوں کے قریب ہے) سلیمان نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے مکرم بندے کونسے ہیں؟ ابو حازمؒ نے جواب میں فرمایا کہ مروت اور حسن سلوک والے۔

مرسلہ..... عبدالجمیل سواتی، گالوچ کبل سوات۔

دیکھو آئے بار بار
بروم برک کے کوکی جار

کہتے ہیں کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ اِس تصویر میں آپ بہت خوب صورت اور رنگا رنگ کوکی جار دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ان میں سے ایک مرتبان آٹھ ہزار ڈالر (دو لاکھ ۵۶ ہزار روپے) میں فروخت ہوا۔ لوسلی بروم برک دنیا کی وہ واحد عورت ہے جس نے کوکی جار کا میوزیم بنا رکھا ہے۔ اس عجائب خانہ میں عجیب و غریب، دیدہ زیب اور رنگ برنگے نئے اور پرانے مرتبان ہیں جن کی قیمتیں تیس سے لے کر تین سو ڈالر تک ہیں اور جن میں سے بعض کی عمریں پچاس سال سے زائد ہیں۔ کوکی جار کے بارے میں کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں ان کی تاریخ، بننے کا میٹریل، پائے جانے کی جگہوں اور قیمتوں کے بارے میں معلومات درج ہیں۔

کولمبس اور انڈا

حنان اکبر علی خان

کوئی چیز جب ایجاد ہو جاتی ہے یا کوئی مشکل ترین کام بھی جب مکمل ہو جاتا ہے تو اتنا آسان معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ اس کا کرنا کچھ ایسا دشوار تو نہ تھا۔ اسی کی ایک مشہور مثال کولمبس اور انڈے کا واقعہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کولمبس نے جب "ہندوستان" دریافت کرنے کا عزم کیا تو اس کے پاس بحری سفر کے لئے وسائل نہیں تھے۔ برسوں تک وہ کوشش میں لگا رہا کہ یورپ کی حکومتوں کے سربراہ اس کے لئے بحری جہازوں کے ایک بیڑے اور سامانِ سفر کا بندوبست کر دیں۔ اسپین کے بادشاہ فردی ناند (فرڈیننڈ) اور اس کی بیوی ایزابیلا اس کے سفر میں دلچسپی لینے لگے تھے کہ اچانک جنگ چھڑ گئی اور ان کی توجہ کولمبس کے منصوبے کی طرف سے ہٹ گئی۔ کولمبس ان سے مدد حاصل کرنے کی کوشش میں چھ سال سے بھی

زیادہ مدت تک اسپین میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اسے بہت سی سختیاں جھیلنی پڑیں مفلسی کا سامنا ہوا۔ اس کا مذاق بھی اڑایا گیا۔ تین مرتبہ تو ایسا ہوا کہ اس نے بادشاہ اور ملکہ کو تقریباً تیار کر ہی لیا تھا مگر کوئی نہ کوئی ایسی رکاوٹ آن پڑی کہ اسے مدد نہ مل سکی۔

آخر کار اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسپین چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب وہ اپنے رخصتی سفر کی تیاریوں میں مصروف تھا تو اسے خبر ملی کہ ملکہ اس کے منصوبوں کے بارے میں مزید جاننا چاہتی ہے۔ کولمبس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ملکہ کے سامنے وضاحت کی کہ اس کا کیا پروگرام ہے اور اس کے لئے اسے کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب ملکہ نے حکم دیا کہ اس سفر کے لئے تمام ضروری سامان فراہم کیا جائے۔

۳ اگست ۱۴۹۲ء کو کولمبس اور اس کے جہازوں نے ایک ایسے بحری سفر کا آغاز کیا جہاں پہلے کسی کا گزر نہ ہوا تھا۔ یہ لوگ مغرب کی جانب زمین کی تلاش میں نکلے۔

اس کا یہ سفر نہایت کامیاب رہا اور واپسی پر اس کا زبردست خیر مقدم کیا گیا اس کو ایک قومی ہیرو کی طرح سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ بارسلونا کے دربار میں بادشاہ اور ملکہ نے اس کا استقبال کیا۔ ایک خصوصی تقریب محل کے باہر کھلے میدان میں منعقد کی گئی۔ وہاں شاہی تخت رکھا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس تقریب کا نظارہ کر سکیں۔ شہزادے، امرا اور مذہبی پیشوا سبھی موجود تھے، احترام کے لئے جیسے ہی کولمبس جھکا بادشاہ نے اسے اٹھایا اور بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس پُر شکوہ دربار میں کرسٹوفر کولمبس کو غیر معمولی عزت دی گئی۔

اسپین کے بڑے پادری نے جو اپنے بادشاہ کی رعایا میں سب سے اعلیٰ فرد اور کلیسا کا سربراہ تھا، کولمبس کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام بھی کیا۔ اس دعوت میں امیر، رئیس، زمین دار، دربار کے اعلیٰ لوگ، شرفا، اور مذہبی رہنما سبھی شریک تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو یہ بات پسند نہ تھی کہ ایک غیر ملکی کو نہ صرف ہسپانوی مملکت کے اندر بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک تک میں اتنی زبردست عزت اور مرتبہ حاصل ہو جائے۔ اس دور کا مقبول موضوع جزائر الہند (IN-DES) اس دن بھی موضوع زیر بحث تھا۔ دعوت میں موجود ایک شخص نے کولمبس کے اس شاندار کارنامے کی اہمیت کو کم کر کے بیان کرنا چاہا:

"مسٹر کرسٹوفر! اگر آپ نے جزائر غرب الہند دریافت نہ بھی کئے ہوتے تو ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کیونکہ ایسا تو نہیں کہ ہمارے ملک میں کوئی سورما نہ ہو جو اسکی کوشش نہ کرتا۔ ہمارا ملک اسپین بڑے مہم جو اور جری لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔"

کولمبس نے کوئی جواب دینے کے بجائے ایک عدد انڈا منگانے کی فرمائش کی۔ اور جب انڈا آگیا تو

اس نے انڈے کو ہاتھ میں لے کر لوگوں کو مخاطب کیا۔ ”معزز حضرات میں آپ میں سے کسی کے ساتھ بھی شرط لگا سکتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی بھی اس انڈے کو سیدھا کھڑا نہیں کر سکتا جس طرح میں اس کو ایسے ہی بغیر کسی چیز کی مدد کے کھڑا کر دوں گا۔“

محفل میں موجود کئی لوگوں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور انڈے کو بغیر کسی سہارے کے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ آخر انڈا گھوم کر کولمبس کے پاس آگیا۔ اس نے انڈے کو میز کے ساتھ ہلکے ہلکے ٹکرا کر اس کا ایک سرا تھوڑا سا پچکا لیا پھر اسے میز پر جما کر کھڑا کر دیا۔ جب مہمانوں نے انڈے کو اسی طرح کھڑا دیکھا تو وہ لاجواب ہو گئے۔ وہ سمجھ گے کہ کولمبس کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہی کہ جب کوئی کام کر لیا جاتا ہے تو ہر شخص جان لیتا ہے کہ اسے کس طرح کیا جائے اور یہ کہ انہیں خود پہلے جزیرے کی تلاش میں جانا چاہئے تھا۔ بجائے اس کہ وہ اس آدمی پر ہنستے جو اس وقت اس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ لیکن سب سے دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ کولمبس امریکہ دریافت کر کے یہ سمجھتا رہا کہ اس نے ہندوستان دریافت کر لیا ہے۔

ہٹو ہٹو مینڈھے کی بریکیں نہیں ہیں۔

پالا، اولے اور برف

سید عدنان یوسف

زمین کے سرد علاقوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں چاہئے کہ برف اور اولوں کے فرق کو سمجھیں۔ ہم کو یہ جاننا چاہئے کہ برف، اولے اور پالا یہ سب پگھلنے پر پانی کی صورت اختیار کرتے ہیں مگر ان سب کو وجود میں لانے والے عوامل الگ الگ ہوتے ہیں۔ جب ہم برف اور اولوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہ خیال آتا ہے کہ جب دونوں ٹھنڈے ہیں اور پگھلنے پر پانی کی صورت اختیار کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے الگ کیوں نظر آتے ہیں۔ اولے (یہاں مطلب جمی ہوئی برف ہے) اس وقت بنتے ہیں جب پانی جم جاتا ہے۔ جب کہ وہ برف جو ہم آسمان سے گرتے ہوئے دیکھتے ہیں آبی بخارات کے جمنے سے بنتی ہے۔ پالا ایک طرح سے آسمان سے گرنے والی برف کی طرح ہوتا ہے مگر وہ برف بلندی پر موجود موسم میں بنتی ہے جب کہ پالا زمینی سطح پر وجود میں آتا ہے۔ راتوں کو زمین اپنے اردگرد کے موسم کے مقابلے میں زیادہ جلدی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ جیسے ہی زمین ٹھنڈی ہوتی ہے، گرم فضا میں موجود آبی بخارات گیس سے پانی میں تبدیل ہوتے ہیں۔ یہ پانی شبنم کہلاتا ہے، جو ہم صبح کو گھاس اور دوسری چیزوں (گاڑیوں کے شیشے وغیرہ) پر دیکھتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر رات کو درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے قریب پہنچ جاتا ہے تو بجائے شبنم کے ہمیں اولے نما پالا دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس طرح آبی بخارات گیس سے فوراً ٹھوس حالت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پالا صاف چمکدار اور ابر سے پاک راتوں میں وجود میں آتا ہے۔ تیز ہوائیں پالا بننے کا عمل پورا نہیں ہونے دیتیں۔

آپ نے پالا ان برتنوں پر بھی دیکھا ہو گا جن میں ہم فریج میں برف جماتے ہیں۔ یہاں بھی وہی معاملہ ہے، جب ہم فریج کا دروازہ کھولتے ہیں تو باہر کی گرم ہوا بخارات سمیت اندر داخل ہو جاتی ہے اور فریج کے اندر یہ بخارات جم کر برتنوں کے گرد پالے کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اب جب آپ فریج کھولیں تو یہ بات ذہن میں رکھیئے گا۔

افیمی کا روپیہ

عبدالقادر

چھوٹا سا ایک شہر تھا اپنے ہی ملک کا
رہتا تھا اس میں ایک افیمی غریب سا

اک رات دس بجے ہوئی بادام کی طلب
لے کر وہ نوٹ جیب میں، گھر سے نکل گیا

بادام کی دکان کی اس کو تلاش تھی
دیکھا ہر اک دکان پہ تالا لگا ہوا

خوش قسمتی سے دیکھ لیا اس نے دور سے
دروازہ اک دکان کا اب تک کھلا ہوا

مانگے دکان دار سے بادام ایک پاؤ
دس روپئے کا نوٹ افیمی نے دے دیا

نو روپئے کی چیز خریدی دکان سے
غلے میں اس کے ایک کھلا روپیہ نہ تھا

کہنے لگا افیمی "کوئی بات ہی نہیں
میں روپئے کے واسطے کل صبح آؤں گا"

دل میں خیال آیا نشانی ضرور ہو
ورنہ یہ خوف ہے کہ دکاں بھول جاؤں گا

بیٹھا ہوا دکھائی دیا بیل سامنے
نقشہ اسی کا ذہن میں اپنے بٹھا لیا

بادام کھائے گھر میں مزے سے تمام رات
دل میں خیال اپنی رقم کا ضرور تھا

معلوم تھا دکان مقابل ہے بیل کے
اس بیل کی تلاش میں گھر سے نکل گیا

چلتا رہا وہ صبح سے اس بیل کے لئے
لیکن کسی مقام پہ اس کا پتہ نہ تھا

اس بیل کی تلاش میں جب دوپہر ہوئی
سائے میں اک مقام پہ بیٹھا ہوا ملا

دیکھا اسے تو جوش مسرت سے یہ کہا
"منزل کو میں نے کوشش و محنت سے پا لیا"

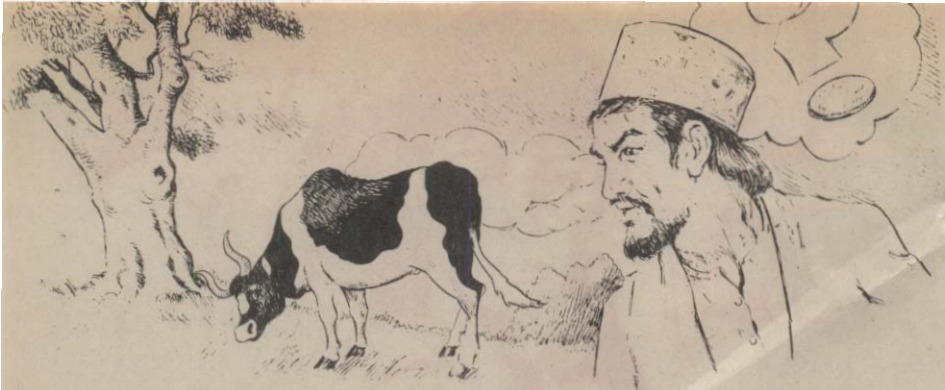

پھرتا رہا تھا بیل بھی گھنٹوں اِدھر اُدھر
درزی کی اک دکان کے اب روبرو ملا

اپنے نشان پر اسے پختہ یقین تھا
درزی کے سامنے ہی افیمی پہنچ گیا

جا کر قریب اس کے افیمی نے یوں کہا
"لوٹائیے حضور وہی میرا روپیا"

درزی نے سر اٹھا کے تعجب سے یہ کہا
"مجھ سے لباس آپ نے سلوایا کون سا؟"

بولا افیمی "بھول گئے بات رات کی؟
تم سے لباس آکے سلائے مری بلا

بادام تم سے میں نے خریدے تھے رات کو
اک روپیہ ہے تم پہ مرا واجب الادا"

درزی کو آیا طیش افیمی کی بات پر
پارہ چڑھا تو زور سے پھنکارنے لگا

"درزی کی یہ دکان ہے، اندھا ہے تو ضرور
پاگل کہیں کا آج مرے منہ کو آگیا"

اب تو گرج کے بولا افیمی بھی جوش میں
"اک روپئے کے واسطے ایمان کھو دیا!

دھوکا دیا ہے تو نے مجھے دشمنِ خدا
نیّت تری خراب ہے، اب میں سمجھ گیا"

چاروں طرف سے لوگ جمع ہو گئے وہاں
آ کر یہی سوال کیا، "ماجرا ہے کیا؟"

بولا افیمی "بات مری غور سے سنو
یہ شخص دغا باز و ریاکار ہے بڑا

کیسی عجیب چال چلی ہے خبیث نے
اک روپئے کے واسطے بہروپیا بنا

درزی کا روپ دھار لیا ہے فریب سے
پیسہ اسے عزیز ہے، پیشہ بدل دیا

تبدیل کی دکان، چلو مانتا ہوں میں
اس کا سبب تو آپ کو میں نے بتا دیا

یہ لمبی داڑھی آئی ہے چہرے پہ کس طرح؟
اس سے کرے سوال کوئی بندۂ خدا

حلیہ بدل کے اس نے یہ کرتب دکھا دیا
لو میں بھی چھوڑتا ہوں یہاں اپنا روپیا"

تم نہیں آؤ

شازیہ فرحین

کراچی کے حالیہ ہنگاموں کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی

ٹرن ٹرن ....

"ہیلو!"

"ہیلو طٰہٰ ہو نا؟"

"ہاں ہاں طٰہٰ، تاریخی شہر لاہور سے بول رہا ہوں ......"

"اچھا تو اس میں اس قدر اِترانے کی کیا بات ہے، میں بھی روشنیوں کے شہر سے مخاطب ہوں جناب۔"

"اچھا اچھا اور سناؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"آج کل میں کھلے میدانوں میں بسنت منا رہا ہوں۔ خوب بڑی بڑی پتنگیں اڑانے میں بڑا ہی لطف آتا ہے، تم ان چھٹیوں کو کس طرح گزار رہے ہو؟"

"میں تو بس بھیا کی تیمار داری میں لگا ہوں انہیں آج کل ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے نا۔"

"اچھا اب کیسی طبیعت ہے؟"

"بس کچھ ٹھیک نہیں۔"

"اچھا امی ابو کو میرا اسلام کہنا، ذرا جلدی میں ہوں۔"

"او کے خدا حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

○

ٹرن .....

"ہیلو ..... طٰہٰ بول رہا ہوں تاریخی شہر ....."

لاہور سے نا.....؟"

"ہاں ہاں تو گویا تم چڑ گئے۔"

"نا بھئی، میں کیوں چڑوں، میں بھی تو منی پاکستان کا باسی ہوں۔"

"اچھا اچھا اب پھیلو نہیں، پچھلے ہفتے کہاں تھے؟"

"بس ذرا ساحل سمندر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہاکس بے گیا ہوا تھا بڑا مزہ آیا، ویسے تم کیا جانو سمندر کا مزا، نیلگوں سمندر کی موجوں سے کھیلتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ جیسے بادل کے گولے ہاتھ میں آگئے ہوں۔"

"ایک تو تم کراچی کی تعریف میں مبالغہ کر جاتے ہو!"

"نہیں بھئی کراچی ہے ہی ایسا، تم ایک دفعہ آکر تو دیکھو۔"

"ہاں دیکھوں گا جب تم اتنی تعریفیں کرتے ہو تو یقیناً کچھ تو ہو گا۔"

"اور تمہارے کزن کی شادی ختم ہوگئی کیا؟"

"ہاں پرسوں دعوت ولیمہ سے ڈیڑھ بجے لوٹے۔"

"کک کیا! ڈیڑھ بجے، سواری مل گئی واپسی پر؟"

"ہاں بھئی یہ کراچی ہے کراچی جہاں راتیں بھی جاگتی ہیں اور دن بھی، اس کی رونقیں تو تمہیں خیرہ کر دیں گی، تم ایک دفعہ آکر تو دیکھو۔"

"واقعی اب تو دیکھنا ہی پڑے گا!"

"اللہ حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

○

ٹرن ..... "ہیلو"

"السلام علیکم۔"

"کیسے ہو؟"

"بس ٹھیک ہوں۔"

"بڑے اداس لگ رہے ہو؟"

"نہیں تو، میں اداس تو نہیں ہوں!!"

"اچھا اک خوشخبری سنو!"

"کیا؟"

"مجھے ابو کچھ دنوں کے لئے کراچی بھیج رہے ہیں۔"

"مگر کیوں؟"

"لو بھئی اب تم بھی پوچھ رہے ہو، بھئی تمہاری ہی تو خواہش تھی کہ میں کراچی آؤں!"

"ہاں ہاں ..... معاف کرنا میں دراصل بہت بھلکڑ ہوں۔"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں کیوں، اچھا ایسا کرو تم کچھ دنوں کے بعد یہاں آنے کا پروگرام رکھو۔"

"کک کک کیوں! کیا ہوا تمہیں تم ثاقب ہی بول رہے ہو نا؟"

"ہاں ہاں، بھئی وہ دراصل ..... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، اس لئے تمہیں صحیح طرح گھما پھرا نہ سکوں گا....."

"اچھا! ویسے میں نے سوچا تھا کہ تم اس خبر کو سن کر خوشی سے اچھل پڑو گے خیر....."

"ارے تم تو ناراض لگتے ہو، بھئی میں تو تمہارے فائدے کے لئے بول رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا سوری!"

"تم پندرہ بیس دن بعد کی تاریخ رکھ لو کوئی بھی۔"

"ٹھیک ہے نا!"

"بالکل ٹھیک۔"

"اللہ حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

○

ٹرن .....

ٹرن ٹرن .....

"ہیلو طٰہٰ بول رہا ہوں۔"

"اچھا!"

"کیا ہوا تمہاری آواز بیٹھی ہوئی لگتی ہے؟"

"بس طبیعت کچھ سنبھلی نہیں۔"

"کیوں کیا ہوا، کیا اب تک بیمار ہو؟"

"ہاں۔"

"کیا علاج نہیں کروایا؟"

"کروایا تھا پتہ نہیں کیوں صحیح نہیں ہوا۔"

"اچھا میں نے تمہیں اطلاع دینی تھی کہ انشاء اللہ پرسوں میں تمہارے عروس البلاد پہنچ رہا ہوں"

"اچھا!"

"کیا ہوا بھئی کیا تم خوش نہیں ہو....

ارے تمہاری آواز کو کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔"

"کک کک کیا تم شاید رو رہے ہو، کیا ہوا میرے دوست تم خیریت سے تو ہو گھر میں تو سب خیریت ہے نا!!"

"پتہ نہیں۔"

"کک کک کیا ہوا مجھے کچھ تو بتاؤ، تم کچھ کہتے کیوں نہیں!"

"اب کہنے کو کچھ نہیں رہا!"

"خدارا اپنے آپ کو سنبھالو ثاقب، کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"میں کیا بتاؤں، بس تم یہاں آنے کا پروگرام .... ملتوی کر دو۔"

"کک کک کیوں!؟"

"اس لئے کہ ان دنوں میرا شہر رو رہا ہے طٰہٰ ... اللہ حافظ۔"

کرکٹ کرکٹ

غلام عباس طاہر

○ ٹیسٹ کرکٹ میں ایک باپ اور اس کے بیٹے نے بیٹ کیری کیا، یعنی کھیل کے آغاز سے لے کر اننگز کے اختتام تک آوٹ نہیں ہوئے۔ یہ اعزاز پاکستان کے نذر محمد اور مدثر نذر کو حاصل ہے۔

○ ۱۹۳۳ء میں لارڈز کرکٹ گراؤنڈ میں مڈل سیکس اور سمرسٹ کے درمیان میچ کھیلا گیا۔ جب ایچ لی آوٹ ہوئے تو جے ڈبلیو لی کی گیند پر ایف ایس لی نے ان کا کیچ لیا۔ یہ تینوں کرکٹر آپس میں بھائی تھے۔

○ ناظم آباد اسپورٹس اور کلفٹن جیم خانہ کراچی کے درمیان ون ڈے میچ کھیلا جا رہا تھا کہ اچانک چند موٹر سائیکل سوار گراؤنڈ میں آگئے۔ انہوں نے کلفٹن جیم خانہ کے کپتان آفتاب بلوچ کو پکڑ کے سر کے بال مونڈ دیئے اس میچ میں سابق ٹیسٹ کرکٹر محسن خان بھی تھے لیکن کوئی کھلاڑی اور امپائر مزاحمت کے لئے نہ آیا کیونکہ موٹر سائیکل سوار مسلح تھے۔ بعد میں وجہ یہ معلوم ہوئی کہ آفتاب بلوچ نے مخالف ٹیم کے کھلاڑی کا کیچ ڈراپ کر دیا تھا۔

○ جولائی ۱۹۳۶ء میں لارڈز کے میدان میں جہانگیر خان نے ٹی این پیٹرسن کو گیند کروائی۔ گیند ہوا میں اڑتی ہوئی ایک چڑیا کو لگی جو وہیں ڈھیر ہو

گئی یہ گیند اور چڑیا لندن میں اب بھی محفوظ ہے۔

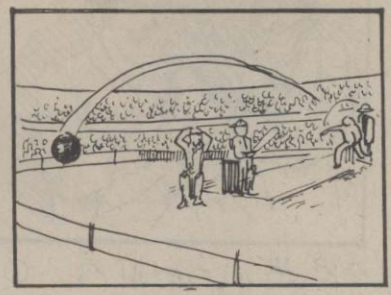

○ ایسیکس کے باؤلر چارلس نے ایک میچ کے دوران گیند کرائی جو بغیر پچ کو لگے بلے باز اور وکٹ کیپر کے اوپر سے ہوتی ہوئی باونڈری لائن پار کر گئی۔ یہ کرکٹ کی تاریخ میں واحد "بائی کا چھکا" بھی ہے۔

○ نزدیک ترین فیلڈنگ کرنے کا اعزاز فریڈ کے بڑے بھائی گریس کو حاصل ہے۔ اسٹوارٹ آسٹریلیا کا مشہور بلے باز تھا۔ اس نے ایک زور دار شاٹ لگائی جس کا کیچ گریس نے لیا۔ گریس بلے باز کے اتنے قریب تھا کہ وہ پاؤں ہلائے بغیر وکٹ کیپر کو گیند پکڑا سکتا تھا۔

○ فیلڈنگ میں سب سے اونچے شارٹ کا کیچ فریڈ نے لیا۔ آسٹریلیا کے مشہور بلے باز بونز کھیل رہے تھے۔ انہوں نے اونچا شاٹ کھیلا۔ جب فریڈ نے کیچ لیا تو اس وقت تک بونز تین رنز بنا چکے تھے۔

○ ۱۹ سال کی عمر سے پہلے اور کم سے کم عمر میں سنچری بنانے کا اعزاز پاکستان کے مشتاق محمد کو حاصل ہے۔ ۱۹۶۱ء میں انہوں نے ۱۷ سال کی عمر میں دہلی کے مقام پر بھارت کے خلاف ۱۰۱ رنز اسکور کئے۔

○ ست رفتار سنچری بنانے کا اعزاز بھی پاکستان ہی کے مدثر نذر کو حاصل ہے۔ انہوں نے یہ سنچری ۹ گھنٹے اور ۱۷ منٹ میں انگلینڈ کے خلاف لاہور میں بنائی۔

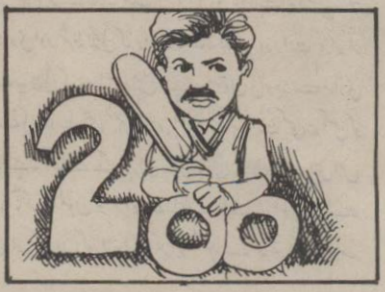

○ کم عمری میں ڈبل سنچری بنانے کا اعزاز بھی پاکستان کے جاوید میانداد کے پاس ہے۔ ان کی عمر ۱۹ سال اور ۱۴۱ دن تھی جب انہوں نے نیوزی لینڈ کے خلاف اکتوبر ۱۹۷۶ء میں یہ سنچری کراچی میں بنائی۔

○ کھانے کے وقفے سے پہلے سنچری بنانے کا اعزاز تین کھلاڑیوں کے پاس ہے جن میں پاکستان کے ماجد خان بھی شامل ہیں۔

○ ایک اوور میں ہر بال پر چھکا، نیش کے بال پر ویسٹ انڈیز کے بلے باز گیری سوبرز نے لگایا اور ۳۶ اسکور کیا۔ پاکستان میں ایک اوور میں ۳۰ رنز کا ریکارڈ ماجد خان اور ظہیر عباس کے پاس ہے۔

نیّر مسعود

سوتا جاگتا ابوالحسن

تیسری قسط

خلیفہ ہارون الرشید حسبِ عادت بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرنے نکلا۔ ایک پُل پر اس کی ملاقات ابوالحسن سے ہوئی۔ ابوالحسن نے خلیفہ کو نہ پہچانتے ہوئے اپنا مہمان بننے کی دعوت دی اور شرط لگائی کہ رات کا کھانا کھا کر اور رات گزار کر صبح ہی صبح وہ چلا جائے گا۔ خلیفہ کے پوچھنے پر شرط کی وجہ ابوالحسن نے یہ بتائی کہ وہ ماضی میں اپنے دوستوں کی وجہ سے ساری دولت لٹا چکا ہے۔ اس لئے کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ لیکن اکیلے کھانے کی عادت بھی نہیں ہے. اس لئے ہر رات کسی نہ کسی کو رات بھر کا مہمان بناتا ہے۔ خلیفہ شرط مان کر ابوالحسن کے گھر چلا جاتا ہے۔ کھانے کے دوران باتوں باتوں میں ابوالحسن اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ کاش وہ ایک دن کے لئے خلیفہ بن جائے تاکہ ظالموں کو سزا دے سکے۔ خلیفہ کچھ سوچ کر اسے دھوکے سے بے ہوش کر کے اپنے محل لے جاتا ہے۔ اور تمام غلاموں اور کنیزوں کو راز دار بنا کر ابوالحسن کے ساتھ ایک ڈرامہ کھیلتا ہے۔

(منظر) خلیفہ کا دربار

سامنے جڑاؤ تخت بچھا ہوا ہے۔ تخت کے پاس کئی امیر، سردار اور جعفر وزیر قیمتی پوشاکیں پہنے بڑے ادب کے ساتھ کھڑے ہیں۔ دو کنیزیں ہاتھوں میں مورچھل لئے تخت کے دونوں طرف کھڑی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک طرف سے ابوالحسن مسرور کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا داخل ہوتا

ہے۔ سب لوگ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک جاتے ہیں۔ ابوالحسن تخت کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ دو امیر آگے بڑھتے ہیں اور بازوؤں میں ہاتھ دے کر اس کو تخت پر بٹھا دیتے ہیں۔ ابوالحسن کے تخت پر بیٹھتے ہی ہر طرف سے "مبارک سلامت" کا شور اٹھتا ہے۔ جعفر وزیر تخت کے سامنے آ کر جھکتا ہے]

جعفر: (تخت کو چوم کر) خدا امیر المومنین پر ہمیشہ اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے اور انہیں ہزاروں لاکھوں برس زندہ سلامت رکھے۔ (آمین، آمین، کا شور)

ابوالحسن: (خوب اکڑ کر تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور آواز کو بھاری بناتا ہے) جعفر! ہم تمہاری وفاداری کی قدر کرتے ہیں۔ تمہیں اور کچھ عرض کرنا ہے؟

جعفر: تمام امیر اور افسر حضور کے سلام کو حاضر ہوئے ہیں۔

ابوالحسن: انہیں ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔

[امیر اور سردار باری باری ابوالحسن کے سامنے آتے ہیں اور اس کو سلام کر کے اپنی جگہ پر واپس جاتے ہیں۔ ابوالحسن ایک ایک کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے]

جعفر: امیر المومنین کوئی حکم دینا چاہیں تو کوتوال کو حاضر کیا جائے۔

ابوالحسن: بے شک، بے شک! ہم کو دو بہت ضروری حکم صادر فرمانا ہیں۔

[جعفر اشارہ کرتا اور کوتوال آگے بڑھ کر تخت کے قریب آ جاتا ہے]

کوتوال: غلام حکم کا منتظر ہے، امیر المومنین!

ابوالحسن: دیکھو میاں کوتوال! سوداگروں کے محلے میں جو مسجد ہے نا! اس کے مُلّا اور اس کے چاروں ساتھیوں کے سر پر تم ابھی جا کر نازل ہو جاؤ۔ پانچوں کی پیٹھیں ننگی کر کے ان پر کوڑے برساؤ اور برسائے جاؤ، برسائے جاؤ یہاں تک کے چیختے چیختے ان کے گلوں سے پھٹے ہوئے بانسوں کی سی آوازیں نکلنے لگیں! سمجھ رہے ہو؟

کوتوال: اچھی طرح، امیر المومنین!

ابوالحسن: پھر ان کے چہروں پر سیاہی مل کر اونٹوں پر سوار کر کے سارے شہر میں پھراؤ اور ایک آدمی ان کے آگے آگے اعلان کرتا جائے کہ دیکھو لوگو! یہ انجام ہے ان کے جو اپنے محلے

والوں کو تنگ کیا کرتے ہیں اور ان کی جھوٹی سچی شکایتیں کرتے پھرتے ہیں۔

کوتوال: غلام ابھی اس کا بندوبست کرتا ہے اور ..... دوسرا حکم امیر المومنین؟

ابوالحسن: دوسرا حکم یہ ہے کہ اسی محلے میں ابوالحسن نام کا ایک نوجوان رہتا ہے۔ آج ہی اس کی ماں کو ایک ہزار اشرفی دی جائے اور کہا جائے کہ یہ تجھ پر خلیفہ کی عنایت ہے۔ بس جاؤ۔

[کوتوال آداب بجالا کر رخصت ہوتا ہے۔ ابو الحسن کچھ دیر خاموش بیٹھا سامنے گھورتا رہتا ہے۔ پھر چونک کر جعفر کو اشارے سے بلاتا ہے]

جعفر: (قریب آکر) حکم، امیر المومنین!

ابوالحسن: دیکھو جعفر! دربار ہم پھر کسی وقت کریں گے کیونکہ اس وقت ہم کو سخت بھوک لگ رہی ہے!

جعفر: بہتر ہے، امیر المومنین! (ہاتھ اٹھا کر آواز لگاتا ہے) دربار برخاست ہوتا ہے۔

[جعفر اور مسرور ابوالحسن کو ہاتھ پکڑ کر تخت سے اتارتے ہیں]

(منظر) محل

[ہارون رشید کے محل میں ابوالحسن کے آگے دسترخوان پر بہترین قسم کے کھانے چنے ہوتے ہیں۔ ابوالحسن کبھی اس قاب پر ہاتھ مارتا ہے، کبھی اس پر۔ ساز بج رہے ہیں اور کئی کنیزیں ناچ گا رہی ہیں]

ابوالحسن: (منہ میں بڑا سا نوالہ ٹھونستے ہوئے) واہ واہ! کیا لذیذ کھانا ہے! اور واللہ! کتنا ..... عمدہ ناچ ہو رہا ہے! اور خدا کی قسم! کیا ہی مزے کا گانا بجانا ہے! مگر اس وقت گانے سے زیادہ کھانے میں مزہ ہے! (خوب زور سے ہنستا ہے) تو پھر ٹھہر جاؤ لوگو! (پھر دسترخوان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ گانا بجانا رک جاتا ہے۔ ابوالحسن سر اٹھا اٹھا کر ایک ایک کنیز کو دیکھتا ہے) آؤ آؤ۔ تم لوگ بھی میرے ساتھ کھاؤ۔ مجھے اکیلے کھانے میں مزہ نہیں آتا۔ (کنیزیں جھجکتی ہوئی بڑھتی ہیں اور وہ دسترخوان پر بیٹھتی ہیں۔ ابوالحسن سب کو طشتریوں میں مٹھائی بانٹتا ہے) ہاں کھاؤ تاکہ تمہاری آوازیں اور میٹھی ہو جائیں! (پردے کے پیچھے سے خلیفہ جھانکتا ہے۔ کنیزیں ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ ابوالحسن چونک

کر ان کو دیکھتا ہے) ایں! یعنی بس؟ اچھا تو پھر ہم بھی کھا چکے۔ (پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ڈکار لیتا ہے) ہمارے آگے سے برتن ہٹائے جائیں، ورنہ ہمیں پھر بھوک لگنے لگے گی..... (کچھ خواجہ سرا لپک کر دسترخوان بڑھاتے ہیں۔ کچھ کنیزیں ابو الحسن کے ہاتھ دھلاتی ہیں، کچھ کنیزیں شربت کی صراحیاں اور بھرے ہوئے گلاس لے کر ابو الحسن کے قریب آتی ہیں۔ شربت دیکھ کر ابو الحسن خوشی سے اچھلنے لگتا ہے) واہ واہ، شربت کیا کہنا!! (ایک کنیز سے) اے خدا کی بندی! تیرا نام کیا ہے؟

کنیز: امیر المومنین! مجھے "سلک مروارید" کہتے ہیں۔

ابو الحسن: سلک مروارید؟ یعنی موتیوں کی لڑی! بڑا احمق تھا جس نے تیرا یہ نام رکھا۔ تیرے دانت تو موتیوں سے بھی زیادہ چمکیلے ہیں! ہے کہ نہیں؟ اچھا تو اسی بات پر تھوڑا سا شربت تو پلا! (اس کے ہاتھ سے شربت لے کر پیتا ہے۔ پھر دوسری کنیز کو دیکھتا ہے) اور تیرا نام؟

کنیز: امیر المومنین! میرا نام "کوکب الصبح" ہے۔

ابو الحسن: یعنی صبح کا تارا؟ مگر تیرا نام تو اس سے اچھا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ تیری آنکھیں ستاروں سے کہیں زیادہ روشن ہیں! ہے کہ نہیں؟ اچھا تو پھر ایک گلاس شربت تو پلا! (اس کے ہاتھ سے بھی شربت پیتا ہے، پیچھے سے خلیفہ جھانک کر ایک کنیز کو اشارہ کرتا ہے، کنیز اپنے گلاس میں چپکے سے بے ہوشی کی دوا ملا دیتی ہے۔ ابو الحسن اب اس کنیز کی طرف مڑتا ہے) اور بھلا تیرا کیا نام ہے؟

کنیز: امیر المومنین! میں "مہ تاب" ہوں۔

ابو الحسن: مگر تیرے چہرے کے آگے تو چاند بھی ماند پڑ جاتا ہے! تیرا نام تو آفتاب ہونا چاہئے تھا۔ ہے کہ نہیں؟ ذرا یہ گلاس ادھر تو بڑھا! (اس گلاس کا شربت بھی پی جاتا ہے)

کوکب الصبح: امیر المومنین اگر اجازت دیں تو میں ایک نیا گیت سناؤں؟

ابو الحسن: ضرور ضرور! اس سے اچھا کیا ہو سکتا ہے!

کوکب الصبح (سازوں کے ساتھ آواز ملا کر دھیمے سروں میں گاتی ہے)

جاگتا ہے کہ سوتا ہے پاگل

یہ محل یہ خوشی یہ ترانے
آنکھ دیکھے مگر دل نہ مانے
سوچ آخر یہ سب کیا ہے پاگل

اس سے پاگل کی جھنکار بھی ہے
غم کے تیروں کی بوچھار بھی ہے
زندگی ایک تماشا ہے پاگل

مُفت جینے کا ساماں یہیں ہے
تیری منزل مگر یہ نہیں ہے
گھر یہ تیرا نہ میرا ہے پاگل

ہاتھ آنا نہیں کچھ یہاں سے
یاد رکھ، آ رہا ہے جہاں سے
پھر وہیں تجھ کو جانا ہے پاگل

ابوالحسن: (دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹتا ہے) واہ! کیا غضب کا گیت..... (بات پوری کرنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے)

خلیفہ: (سامنے آ کر) "کافور!! (کافور ایک طرف سے داخل ہوتا ہے) اس کا لباس اتار کر وہی پرانے کپڑے پہنا دو اور اسے پیٹھ پر لاد کر اس کے مکان میں، جہاں یہ پہلی مرتبہ بے ہوش ہوا تھا، ڈال آؤ۔ مکان کا دروازہ کھلا چھوڑ دینا۔ (کنیزوں اور خواجہ سراؤں سے) "اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس کے محلے کے ملا اور اس کے چاروں ساتھیوں کو ان کے کرتوتوں کی سزا ملے۔ میں نے اس کی یہ خواہش اسی کے ہاتھوں پوری کرا دی..... اور اب اس کو اپنی پچھلی زندگی کی طرف لوٹ جانا ہے۔"

[چلا جاتا ہے۔ غلام اور خواجہ سرا ابوالحسن کا شاہی لباس اتارنے لگتے ہیں]

(پھر کیا ہوا؟ اگلے شمارے میں پڑھیے)

بھالو کا پنجرہ جو بند کرنا بھولا
بھالو نے کچلا، بھولے کا کولہا

سید افتخار دانش

جب ہم بہت چھوٹے تھے تو چڑیا گھر کو چڑیا کا گھر سمجھتے تھے۔ پھر جب پہلی بار چڑیا گھر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں شیر، ہاتھی، چیتا، گینڈا، ریچھ، بھالو، بندر اور نہ جانے کیا کیا دیکھا۔ اتنے سارے جانوروں کو دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ سوچا "یہ جانور یہاں کیا کر رہے ہیں...... شاید چڑیا کے مہمان ہیں۔" بھائی جان سے پوچھا تو انہوں نے حسبِ عادت فلسفہ بگھارا۔

"چڑیا گھر میں ہاتھی چڑیا...... بھئی پنجرے میں بند شیر ہو یا چیتا..... یا چڑیا.... سب ہی قیدی ہوتے ہیں..... اور سب ہی قیدی برابر ہوتے ہیں۔"

لیکن اگر کبھی پنجرہ کھلا رہ جائے تو یہی چڑیا جیسے جانور وحشی درندوں میں بدل جاتے ہیں اس صفحے پر آپ جو تصویریں دیکھ رہے ہیں وہ ایک ایسے ہی واقعہ کی تصاویر ہیں۔

برلن کے چڑیا گھر میں کام کرنے والے کارسٹن بیئر نے اپنے خیال میں ریچھ کا پنجرہ اچھی طرح بند کرنے کے بعد کھلے حصے کی صفائی کا ارادہ کیا۔ چار سو پونڈ وزنی بھورے ریچھ نے کسی نہ کسی طرح پنجرے کا دروازہ کھول لیا اور کارسٹن پر وحشیانہ حملہ کر دیا۔ ایک تماشائی نے اس منظر کو کیمرے میں محفوظ کر لیا۔ حالانکہ صرف دو منٹ بعد ہی کارسٹن کے ساتھی نے ریچھ کے سر پر پھاوڑے کی زور دار چوٹیں لگا کر کارسٹن کو اس کے پنجے سے چھڑا لیا مگر اتنی سی دیر میں ریچھ کارسٹن کو بری طرح زخمی کر چکا تھا۔ کارسٹن کے بازوؤں، سر اور کولہے پر شدید زخم آئے تھے حالانکہ وہ اس حادثے میں معجزانہ طور پر زندہ بچ گیا تھا پھر بھی اُسے ایک ہفتے تک اسپتال میں داخل رہنا پڑا۔

کنگرو کے بھائی بہن

عباس عالم

کوآلہ

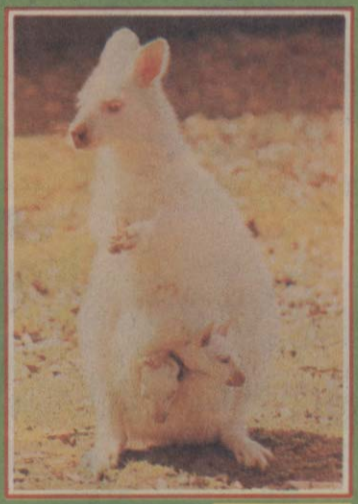

کنگرو

اوپسم

کنگرو کی ایک نئی نسل

تسمانیہ ڈیول

آپ نے ٹی وی پر کنگرو تو دیکھا ہوگا۔ شاید چڑیا گھر میں بھی دیکھا ہو اور اگر کنگرو دیکھا ہے تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ مادہ کنگرو کے پیٹ میں ایک تھیلی سی بنی ہوتی ہے جہاں وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو رکھ سکتی ہے۔ اس تھیلی میں مزے سے بیٹھے ہوئے ننھے منے کنگرو آس پاس کے تمام خطرات سے محفوظ ہوتے ہیں۔ نہ سردی کا ڈر نہ گرمی کا خطرہ اور نہ ہی یہ خوف کہ کوئی سانپ وغیرہ کاٹ لے گا۔ کنگرو جیسا کوئی جانور ہمارے ملک میں تو نہیں پایا جاتا جس کے پیٹ میں اس طرح کی تھیلی ہو بلکہ ہمارا ملک ہی کیا پوری دنیا میں ایسے جانور بہت کم ہی ہوتے ہیں لیکن یہ مت سمجھئے گا کہ تھیلی والے یہ جانور یعنی (Pouched mammals) صرف آسٹریلیا ہی میں پائے جاتے ہیں اور باقی دنیا ایسے جانوروں سے بالکل خالی ہے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج سے بہت پہلے پوری دنیا میں ایسے جانور پھیلے ہوئے تھے جن کے پیٹ میں تھیلیاں ہوتی تھیں۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے کتنے پہلے کی؟ یہ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ نے ڈینو ساروں کا ذکر تو سنا ہی ہوگا۔ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ آج سے صدیوں پہلے ڈینو سار دنیا پر راج کرتے تھے۔ تو بس یوں سمجھئے کہ جس زمانے میں دنیا پر ڈینو ساروں کی حکمرانی تھی ٹھیک اس زمانے میں یہ تھیلی والے جانور بھی دنیا میں بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ دنیا ہمیشہ سے اس طرح کی نہیں ہے جیسی آپ اسے اب دیکھتے ہیں۔ اب تو یہ ہے کہ نا کہ بہت سارے براعظم ہیں۔ ایشیا کہیں ہے یورپ کہیں اور۔ اور امریکہ تو اتنی دور ہے کہ پوچھیں مت۔ لیکن شروع شروع میں یہ بہت سارے براعظم نہیں تھے بلکہ ایک ہی بہت بڑا سا ہرا بھرا براعظم تھا جس میں ہر طرح کے جانور رہتے تھے اور انہی جانوروں میں طرح طرح کے تھیلی والے جانور بھی رہا کرتے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ جغرافیائی تبدیلیاں ہوئیں اور خشکی کے بڑے بڑے ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ ہو کر بکھرنے لگے اور موسم کچھ اس طرح کا ہو گیا کہ تھیلی والے جانور مرنے لگے اور دوسری طرح کے جانور مثلاً ہرن بارہ سنگھے اور دوسرے چوپائے ان کی جگہ لیتے گئے۔ ہاں دنیا کے کسی کسی علاقے میں تھیلی والے جانور بھی باقی رہے۔ آسٹریلیا ایک ایسا ہی علاقہ ہے جہاں کی آب و ہوا اور جنگل کا ماحول تھیلی والے جانوروں کے لئے ساز گار رہا۔

ان جانوروں میں کنگرو، اوپسم، کوآلہ بینڈیکوٹ اور تسمانیہ ڈیول اب بھی آسٹریلیا کے مختلف علاقوں میں دکھائی دے جاتے ہیں۔ کنگرو تو خیر اتنا مشہور ہے کہ دنیا کے لوگ آسٹریلیا کو بھی کنگرو کے نام سے جانتے ہیں لیکن باقی جانور اتنے مشہور نہیں ہیں۔ بہت سے لوگوں کو تو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا

کہ کنگرو کے علاوہ بھی ایسے جانور ہوتے ہیں جن کے پیٹ میں تھیلی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو بھی یہ بات نہ معلوم ہو۔ خیر اگر معلوم نہیں بھی تھی تو اب ہم نے بتا دی ہے تاکہ آپ دوسروں کو بتا سکیں کہ آسٹریلیا کے جنگلات میں صرف کنگرو ہی نہیں بہت سے دوسرے جاندار بھی ہیں جن کے ننھے منے بچے اپنا بچپن ایک تھیلی میں گزارتے ہیں۔ یہ بات دوسری کہ اب یہ جانور ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

پہلے تو ان کو قدرتی آفات کا سامنا کرنا پڑا تھا جن سے یہ بچ بچا کر آسٹریلیا میں آباد ہو گئے تھے لیکن اب وہاں کے جنگلات بھی ختم ہو رہے ہیں۔ فیکٹریاں لگ رہی ہیں اور جنگلات کو کاشت کیا جا رہا ہے۔ ہم ان جانوروں سے بھی ملے تو نہیں پھر بھی دل بہت چاہتا ہے کہ ہمارے ملک سے بہت دور ایک ملک میں جنگلات میں رہنے والے یہ ننھے منے جانور ہنسی خوشی زندہ رہیں۔ آپ بھی یہی چاہتے ہیں نا۔

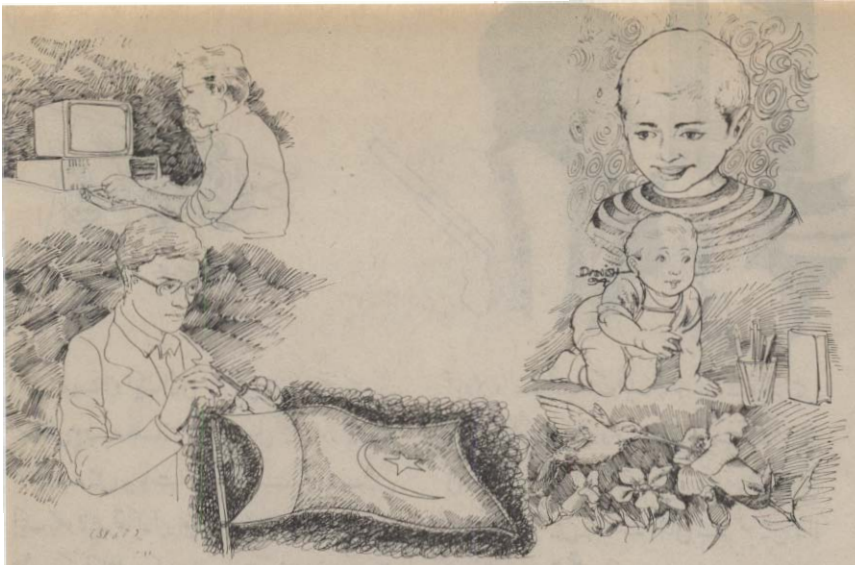

پاکستان ہے اپنی جنت

آصف وقار آصف

میری بس یہ دعا ہے یارب
اپنے وطن میں شاد رہیں سب

مل کے کریں ہم اس کی خدمت
بھول کے سارے جاہ و منصب

مجھ کو دے تو اتنی ہمت
جذبوں میں ہو اتنی طاقت

دشمن کو پھر زیر کروں میں
ثابت کردوں حق کی قوت

قائد کا فرمان یہی ہے
ارشاد قرآن یہی ہے

مل کر ہم سب دکھ سکھ بانٹیں
مسلم کا ایمان یہی ہے

بچے پاکستانی سارے
روشن روشن چاند ستارے

دل میں ہو اقبال کا جذبہ
وہ اللہ ہے ساتھ ہمارے

آزادی کو سمجھیں نعمت
ہم پر لازم اس کی حفاظت

ہم سب کا ہے نعرہ آصف
"پاکستان ہے اپنی جنت"

ایک کپ چینی

محمد شاہد فیروز

میرے ابو ایک ایسی فرم میں ملازم تھے جس کی شاخیں پورے ملک میں بکھری ہوئی تھیں اور میرے مشاہدے میں یہ بات اس وقت سے تھی جب میں ایک چھوٹا بچہ تھا کہ ابو ہمیشہ نوکری میں ترقی اور گردو پیش کے تعلقات کو بڑھانے میں مصروف رہتے تھے اِس وجہ سے ہمیں اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا تھا وقت کے ساتھ جب میرا بچپن جوانی میں تبدیل ہوا اس عرصے میں ہم بیس مختلف قصبوں اور شہروں میں رہ چکے تھے اِس اکثر ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے امی تنہائی کے مرض میں مبتلا ہو گئیں تھیں ہمسایوں پر انحصار سماجی رابطے کیلئے ہوتا ہے جبکہ وہ نئی ہمسائیگی میں پرانے ہمسایوں کے غم میں تنہا رہتی تھیں اور نئے لوگوں میں شرماتی رہتی تھیں اور کسی کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں بنا سکی تھیں اِس صدی کے اوائل میں جب ہمیں اپنے ملک سے ہی جانا پڑا تو امی مکمل طور پر ذہنی خلفشار کا شکار ہو چکی تھیں اجنبی ملک اجنبی قصبہ اور اس پر اجنبی اور غیر یقینی سا موسم امی کی پریشانی اور تنہائی میں اضافہ کا باعث تھا ہم ایک گنجان آبادی والے قصبے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے لوگ ایک دوسرے کے قریب تھے مگر امی کئی ہفتوں بعد بھی اپنی کسی ہمسائی کے ساتھ دوستی نہیں کر سکی تھیں۔ ہر وقت تنہائی کے غم میں مبتلا بجھی بجھی سی رہتی تھیں ایک رات جب ابو اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے باہر تھے میں اور امی کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ہمارے پچھلے دروازے پر ایک کمزور سی دستک ہوئی امی نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک عورت کھڑی تھی جو ایپرن سے ہاتھ صاف کر رہی تھی یہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی ”میں اس طرح اچانک چلے آنے پر معذرت چاہتی ہوں مگر کیا کروں کہ میں ابھی کیک بنانے کے درمیان ہوں اور اب پتا چلا ہے کہ چینی ختم ہے مہربانی فرما کر ایک کپ چینی دیں جونہی میرے شوہر والٹر بازار سے چینی لائیں گے میں واپس کر دوں گی اور مجھے مارٹینا والٹر کہتے ہیں۔“ ہماری نئی ہمسائی نے رکے بغیر مگر نہایت شائستگی سے کہا تو امی نے پورا کنستر انہیں تھما دیا امی اس اچانک ملاقات سے کافی ہشاش بشاش ہو گئی تھیں۔

"میں کل واپس کر جاؤں گی۔"

"کوئی جلدی نہیں ہے۔" امی نے سخاوت سے کہا جب وہ چلی گئیں تو امی ایک گہرے غم میں ڈوب گئیں، یوں جیسے خوشیوں کی نوید لانے والا پیامبر اچانک آئے اور کوئی خبر سنائے بغیر چلا جائے امی نے اداس ہو کر خود کو باورچی خانے کی کرسی پر گرالیا اور اس مڈبھیڑ پر غور کرنے لگیں جو ان کے قریب ایک اہم سماجی واقعہ تھا در حقیقت یہی واقعہ آئندہ زندگی میں ان کی اور آنٹی مارٹینا والٹر کے درمیان طویل اور گہری دوستی کا سبب بنا اور ایک دوسرے کے اتنا قریب ہوئیں جیسے دو بہنیں ہوں۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑا عطیہ تھا کہ ہمیں نہ صرف اچھی آنٹی ملی تھی بلکہ انکل والٹر بھی ایک شفیق انسان تھے اور آنٹی مارٹینا کی وجہ سے ہی امی تنہائی کے خول سے نکل کر زندگی کی گہما گہمی میں شامل ہو گئی تھیں یوں ہماری زندگی بڑے مزے سے گزرنے لگی۔

کئی سالوں بعد آنٹی مارٹینا والٹر نے ہمارے صحن میں بیٹھے ہوئے امی پر ایک انکشاف کیا اور امی حیرت زدہ رہ گئیں۔

"ایلی سسٹر! تمہیں یاد ہے ہماری دوستی کی ابتدا کیسے ہوئی تھی؟" آنٹی نے امی کو مخاطب کیا۔

"ہاں تم چینی کا کپ ادھار لینے آئی تھیں"

"ٹھیک، مگر تمہیں یہ معلوم نہیں کہ مجھے چینی کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی۔" آنٹی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور امی نے حیرت سے کہا تھا "واقعی!"

"ہاں ایلی سسٹر یہ تو بات کرنے کا ایک سادہ سا طریقہ تھا اور اپنی موجودگی کی اطلاع دینے کی ایک تیکنک تھی۔"

"وہ کس طرح!" امی کی حیرت برقرار تھی۔

"چینی کا کپ ادھار لینا ہمیشہ سے باورچی خانے کی ہر عورت کے لئے دوسرے کے پاس جانے کا اہم ذریعہ رہا ہے ایک اچھے ہمسائے کے بغیر نئے گھر کا مزا کبھی مکمل نہیں ہو سکتا اور ایک اچھا ہمسایہ اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کوئی اسے بنانے کی کوشش نہ کرے یوں ایک کپ چینی ادھار مانگ کر یا دے کر ایک اچھا ہمسایہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ تم حیران ہو رہی ہو شاید میرے فلسفے پر مگر میں تمہیں ایک واقع سناتی ہوں جسے سن کر تم یقیناً سمجھ جاؤ گی اور جو آئندہ زندگی میں تمہارے کام آئے گا۔" آنٹی نے امی کی حیرت کو بھانپتے ہوئے کہا اور پھر واقعہ سنانے لگیں ــــــــ "ہم چھ بہن بھائی تھے ابو سرکاری ملازم اور کام سے کام رکھنے والے تھے اور امی کے مزاج میں سختی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہم جب بھی کسی نئے گھر میں جاتے تو امی ہمیں پاس بلا کر ہمارے کان کھولتیں کہ دیکھو ہمسایوں کے گھر مت جانا ان کے باغ اور آرام کا خیال رکھنا اور خبردار جو ان کو بلاوجہ بلایا اور ہم سب امی کے خوف سے اس پر عمل کرتے تھے اور ہاں اب بھی یاد ہے کہ وہ کتنا عجیب آدمی تھا دوسرے ہمسایوں اور والدین سے مختلف۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک دفعہ جو ہم پرانا گھر تبدیل کر کے نئے گھر میں

گئے تو ہمیں جو ہمسایہ ملا وہ بوڑھا شخص تھا ہمیں نئے گھر میں گئے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور اس عرصے میں ہم نے اس بوڑھے میاں میں جو خاص بات نوٹ کی وہ یہ تھی کہ اکثر ہمیں اداس نظروں سے دیکھتا رہتا تھا اور چہرے پر رنج والم کے عجیب سے تاثرات نظر آتے تھے جو ہمیں پریشان اور دہشت زدہ کئے رکھتے اور امی تو اس رویئے کی اتنی دہشت ناک وضاحت کرتی تھیں کہ اف توبہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کئی ہفتے مزید گزر گئے مگر بوڑھے میاں کے رویئے میں بال برابر فرق نہ آیا وہ ہمیں متواتر انہیں نظروں سے دیکھتا رہا اور ہم ڈرتے رہے ایک دن ہم چھ کے چھ بہن بھائی گھر کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اس بوڑھے میاں نے بڑے مہذب اور شاہانہ انداز میں ہمیں مخاطب کیا اور ہم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "تم بچے خاموش کیوں رہتے ہو اور اپنے تیز شور سے گھر کی رونق کیوں نہیں بڑھاتے جبکہ تمہیں ایسا کرنا چاہئے۔"

"نہیں جناب ہمیں اس کی اجازت نہیں۔" میرے بھائی نے ذرا ہمت سے جواب دیا۔

"بچو میں بھی تمہاری عمر کے ایک بچے کا باپ تھا۔" اس نے کہا۔ "اور میں اس کی ننھی فرمائش پر اس کے لئے واٹر گن تیار کرنا چاہتا تھا مگر افسوس کہ وہ اس فرمائش کے فوراً بعد ہی ہم سے روٹھ کر دور موت کی وادی میں چلا گیا وہ بہت شریر تھا اور نت نئی فرمائشیں کرتا رہتا تھا میں اب چاہتا ہوں کہ اس کی آخری کی ہوئی فرمائش پوری کروں کیا تم اس کام کی تکمیل میں میرے چھپر میں آکر میری مدد کرو گے"؟ بوڑھے میاں کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ہم سے انکار نہ ہو سکا لہٰذا ہم امی کے حکم کی پروا کئے بغیر مگر بڑی راز داری سے یہ کام مکمل کرنے لگے۔

واٹر گن کی بنیاد ایک بڑی سی نکل پلیٹڈ ٹیوب تھی جو دو فٹ لمبی تھی اس کے آخر پر ایک قلم کے نقطے جتنا سوراخ والا نوزل لگا دیا گیا تھا اور جب ایک Planger کو پائپ کے ساتھ فٹ کیا گیا تو ہماری واٹر گن تیار تھی اس تیار شدہ گن کی ریخ (مار) اس چھپر سے لیکر ہمارے باورچی خانے تک تھی جونہی گن تیار ہوئی بوڑھے میاں نے ہمیں ایک خوفناک مگر دلچسپ منصوبے سے آگاہ کیا وہ واٹر گن کو استعمال میں لاکر ہماری امی کے اکھڑے اکھڑے اور تلخ رویئے کو درست کرنا چاہتا تھا جسے ہم نے بخوشی قبول کر لیا اب وہ اپنے چھپر میں چھپ کر پانی والی بندوق سے اسپرے کرتا تو پانی کی دھار سیدھی باورچی خانے میں موجود امی پر پڑتی اور امی چیخیں مارتی اور تقریباً بھاگتی ہوئیں باغ میں چلی آتیں اور جواب میں بوڑھے میاں ایک گرج دار قہقہہ لگا دیتے ہم امی کے سامنے خاموش کھڑے رہتے مگر جیسے ہی وہ اندر جاتیں ہماری ہنسی کے فوارے چھوٹ جاتے۔ امی نے جب ہمارے اس رویئے کو دیکھا تو سمجھ گئیں کہ بچے بوڑھے میاں سے مانوس

ہو چکے ہیں اور اس سے مل کر میرے رویئے کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے رویئے کو تبدیل کرنا شروع کر دیا اور ایک دن وہ وقت آیا کہ امی نے بوڑھے ہمسائے کی بیوی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنا ڈالا بوڑھے میاں کی بیوی ہر وقت صحن میں خاموش اور تنہا بیٹھی رہتی تھی امی نے ایک خالی کپ لیا اور اس کے پاس ایک کپ چینی ادھار لینے چلی گئیں اور یوں یہ ہمسایوں کے ساتھ اچھی دوستی کی ابتدا تھی اب امی ہمیں اکثر سمجھاتی تھیں کہ دیکھو بچو! ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات کے بغیر زندگی بہت بے مزہ ہے۔ یہ تعلقات جتنے مضبوط اور دوستی پر مبنی ہونگے زندگی اتنی خوشگوار اور پرسکون ہوگی اور یہ تعلقات اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتے جب تم خود ایک اچھے ہمسائے نہ بن جاؤ اس کے بعد ہم نے بہت سے گھر بدلے مگر ہمسایوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے میں امی کو پھر کبھی تکلیف نہ ہوئی ان کا ایک کپ چینی مانگنے والا فارمولا ہر جگہ کامیاب رہا اور وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ایک کپ چینی مانگنا یا دینا تعلقات میں مٹھاس کی آمیزش کا سبب ہے ہم امی کی اس تبدیلی پر جب بھی غور کرتے وہ بوڑھے میاں شدت سے یاد آتے تھے جن کی زندگی بیٹے کی موت سے تلخ ہو چکی تھی مگر انہوں نے ہمیں ایک کپ چینی کا دے دیا تھا جس نے ہماری زندگی کو شہد سے بھی میٹھا کر دیا تھا اور ہم اب خاموش بچے نہیں تھے بلکہ ہمارے قہقہے دور دور تک گونجتے تھے اب امی کو دنیا سے رخصت ہوئے بہت عرصہ بیت چکا ہے میں شادی شدہ ہوں اور تین بچوں کی ماں ہوں مگر میں نے امی کے اس بنائے ہوئے فارمولے کو کبھی نہیں چھوڑا اور اس فارمولے کی کامیابی کا ایک ثبوت تم بھی ہو تمہاری ہمسائی نے جب اپنی داستان ختم کی تو امی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اس کے بعد ہمارا ان کا ساتھ کافی دیر تک رہا پھر حسب معمول ابو کی تبدیلی ہو گئی اور ہمیں ایک نئے مکان میں جانا پڑا مگر اب کی بار امی نہ تو پریشان تھیں اور نہ ہی مزاج میں اکتاہٹ تھی بلکہ وہ بڑی محبت سے اپنی ہمسائی دوست سے مل کر نئے گھر آئی تھیں ہم نئے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے کمرے سجا لئے گئے تھے امی باورچی خانے میں مصروف تھیں جبکہ میں اور ابو خوش گپیوں میں کہ امی باورچی خانے سے برآمد ہوئیں ان کے ہاتھ کیک بنانے والے مواد سے لتھڑے ہوئے تھے اور وہ انہیں ایپرن سے صاف کرتی ہوئی باہر جا رہی تھیں ہم نے حیرانی سے پوچھا کہ کدھر جا رہی ہیں تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ شوخ سے لہجے میں بولیں اپنی ہمسائی سے ایک کپ چینی لینے کیونکہ تمہیں اس وقت تک اچھے پڑوسی نہیں مل سکتے جب تک کہ تم خود اچھے پڑوسی نہ بن جاؤ میں یہ بات سن کر مسکرا دیا جبکہ ابو حیران تھے کہ امی میں یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی۔ اگر وہ مجھ سے پوچھتے تو میں بلا تامل کہہ دیتا کہ ایک کپ چینی سے ــــــ

(مرکزی خیال ماخوذ)

سب سے بڑے قومی رہنما

ڈاکٹر اسلم فرخی

ترقی ملی تو سید احمد بڑے خوش ہوئے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ تبادلہ بھی ہو گیا ہے تو پریشانی ہوئی۔ دوستوں اور جاننے والوں نے کہا پریشانی کی کیا بات ہے۔ روہتک دلی سے دور ہی کتنا ہے۔ گھر آنگن والی بات ہے۔ پریشان نہیں ہونا چاہئے مگر سید احمد کو یہ پریشانی بھی تھی کہ وہ انگریزی سرکار کے عہدے دار ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور عالم مولوی نوازش علی سے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے۔ تبادلے سے اس تعلیم کے ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ آخر انہیں ایک تدبیر سوجھی۔ مولوی صاحب کے پاس گئے اور کہا۔ "آپ بھی میرے ساتھ روہتک چلیں۔ اس طرح میری تعلیم جاری رہے گی۔" مولوی صاحب یہ سن کر بڑے حیران ہوئے کہنے لگے۔ "میاں سید احمد بات تو تم نے خوب سوچی مگر میں کیسے جا سکتا ہوں۔ اتنے بہت سے طالب علم میرے ساتھ رہتے ہیں ان کا کھانا کپڑا بھی میرے ذمے ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر چلا جاؤں تو یہ کیا کریں گے؟ سید احمد نے فوراً کہا "انہیں بھی ساتھ لے چلئے ان کا سارا خرچ میرے ذمے۔ اس طرح میری تعلیم کا نقصان نہیں ہوگا۔" اس طرح سید احمد نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ یہ شوق اور لگن کی بات تھی ورنہ عام قاعدہ ہے کے ادھر نوکر ہوئے اور پڑھنے لکھنے سے فارغ۔ مگر سید احمد تو کچھ اور ہی قسم کے انسان تھے محنتی مستعد اپنی قابلیت اور معلومات بڑھانے اور قومی خدمت کرنے کو فرض سمجھنے والے بڑے آدمی۔

سید احمد دلی میں پیدا ہوئے۔ ددھیال میں سب لوگ دربار کے اعلیٰ عہدوں پر۔ باپ کو دربار سرکار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اللہ والے آدمی تھے۔ ننھیال شاہی وزیروں کا گھرانا، ریاضی اور تاریخ میں کمال رکھنے والا خاندان، والدہ نہایت سمجھدار اور اچھا برا سمجھنے والی خاتون۔ سید احمد نے بڑے اچھے ماحول اور حالات میں پرورش پائی۔ اچھے استادوں سے پڑھا ان کے ایک بڑے بھائی تھے، سید محمد۔ دلی سے اردو میں اخبار جاری ہوئے تو دونوں بھائیوں نے مل جل کر ایک اخبار نکالا۔ نام تھا "سید الاخبار"۔ کچھ دن جاری رہا۔ سید احمد اس کے لئے مضمون لکھتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا

یہ شوق روز بروز بڑھتا گیا۔ ملازمت بھی کرتے رہے اور لکھتے بھی رہے۔دلی میں مسلمان بادشاہوں کی بنوائی ہوئی بے شمار خوبصورت اور شاندار عمارتیں تھیں۔ مگر ان کی کوئی دیکھ بھال نہیں تھی۔ سید احمد کو خیال آیا کہ ان تاریخی عمارتوں کا حال احوال لکھ لیا جائے ورنہ پھر کسی کو ان کے بارے میں معلومات نہیں ہو سکے گی۔ اور عمارتیں برباد ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر انہوں نے تاریخی عمارتوں کا حال لکھنا شروع کیا۔ خود جاتے تھے۔عمارت کے مختلف حصوں کو دیکھتے تھے،ناپ جوکھ کرتے تھے۔ جو پتھر لگے ہوئے تھے ان پر لکھی ہوئی عبارتوں کو پڑھتے تھے۔ یہ سب بڑی محنت کے کام تھے مگر بڑائی محنت ہی سے ملتی ہے۔ سید احمد نے محنت کی۔ انہیں بھی بڑائی ملی۔ ایک کتاب تیار ہو گئی۔ "آثار الصنادید" نام رکھا گیا۔ ولایت تک اس کتاب کی دھوم ہوئی۔

سید احمد لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ ملازمت کے امتحان بھی پاس کرتے رہے۔ ترقی ملتی رہی۔ بجنور نامی شہر میں کام کر رہے تھے کہ آزادی کی جنگ شروع ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی اس جنگ میں انگریزوں کو ملک سے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آپس میں اتحاد نہیں تھا۔ تنظیم بھی نہیں تھی۔ اس وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔سید احمد نے بجنور میں اپنی جان کی پروانہ کر کے انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچائی۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو انگریزوں نے انعام کے طور پر ایک مسلمان رئیس کی جاگیر انہیں دینا چاہی مگر سید احمد نے صاف انکار کر دیا جاگیر نہیں لی۔ یہ کہا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں جاگیر لے کر جاگیردار بن جاؤں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ملک کے مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہو گئی۔انگریزوں نے بادشاہت انہیں سے چھینی تھی اس وجہ سے وہ مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ جنگ آزادی کا ذمہ دار بھی انہیں کو ٹھہرایا گیا۔ مسلمان خود بھی غفلت میں ڈوبے ہوئے تھے کاروبار،تجارت،ملازمت سب سے الگ تھے۔پڑھنے لکھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ انگریزوں کی وجہ سے سارے ملک میں نئے خیالات اور انگریزی تعلیم پھیل رہی تھی مگر مسلمانوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ ایک طرف تو یہ صورت دوسری طرف انگریزوں کا ظلم۔مسلمانوں کی جائدادیں، زمینداریاں، اور جاگیریں ضبط ہو گئیں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو پھانسی دے دی گئی۔ گھر کھدوا دیئے گئے۔ مسلمانوں کے محلے ویران ہو گئے بڑا سخت وقت تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر مسلمانوں کو پھانسی دے دی جاتی تھی۔

سید احمد ۱۸۵۸ء میں ترقی پا کر مراد آباد چلے گئے تھے مگر دن رات مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کو دیکھتے اور ان کی ترقی کی تجویزیں سوچتے۔ انہیں دنوں مراد آباد میں قحط پڑ گیا۔ سید احمد نے ایسا اچھا انتظام کیا کہ لوگ بھوکوں مرنے سے بچ گئے یہیں

حدیث شریف

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو درخت کے سائے میں بے ہوش پڑا تھا، لوگ اسے پانی کے چھینٹے دے رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے؟"

لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ روزہ سے تھے، برداشت نہ کر سکے، غشی آ گئی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے اور تمہارے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی دی ہوئی رخصت سے فائدہ اٹھاؤ۔"

مرسلہ: نیرا خان۔ کراچی۔

انہوں نے ایک فارسی مدرسہ قائم کیا اور ایک بڑی زبردست کتاب لکھی ہے تو چھوٹی سی مگر بہت زبردست نام ہے۔ "اسبابِ بغاوتِ ہند" انگریز مسلمانوں سے بہت ناراض تھے انہیں جنگ کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ پوری مسلمان قوم کے خلاف ہو گئے تھے۔ کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان حالات میں سید احمد نے بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ اسباب بغاوت ہند لکھی اس کتاب میں انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ یہ جنگ انگریزی حکومت کی خرابیوں، بدانتظامی اور بے جا سختی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس زمانے میں یہ بات لکھنا بڑے حوصلے کا کام تھا مگر سید احمد نے کوئی پروا کئے بغیر یہ بات لکھی اور قومی خدمت کا حق ادا کیا۔

سید احمد نے یہ بھی سوچا کہ انگلستان اور یورپ میں جو ترقی ہوئی ہے، نئی نئی معلومات اور خیالات عام ہوئے ہیں، برصغیر کے مسلمان ان سب سے بے خبر بھی ہیں اور ان سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ اگر یہ خیالات ملک میں نہ پھیلے تو سب لوگ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یہ سوچ کر انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی نے سائنس کی بہت سی اچھی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروائیں۔ سوسائٹی میں علمی لیکچر بھی ہوتے تھے اس سوسائٹی نے بڑا مفید کام کیا اور لوگوں میں سائنس سے دلچسپی پیدا کی۔ ایک تو سائنس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اردو زبان میں نئی نئی علمی کتابیں بھی تیار ہو گئیں۔ سید احمد نے یہ سوسائٹی غازی پور میں شروع کی تھی۔ جب وہ علی گڑھ آ گئے تو یہیں سوسائٹی کے لئے ایک عمدہ عمارت بنوائی انہیں تعلیم پھیلانے سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ ایک مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا تھا۔ ایک اسکول غازی پور میں بھی قائم کر دیا۔ نئے خیالات بھی پھیلائے تعلیم بھی پھیلائی زبان کی خدمت بھی کی۔ قوم کو ہر طرح آگے بڑھاتے رہے۔

اب سید احمد کو یہ خیال ہوا کہ انگلستان جا کر وہاں کی ترقی اسکولوں اور کالجوں کو خود دیکھنا چاہئے بہت سے انگریز عالموں نے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے بارے میں بڑی غلط اور فضول باتیں اپنی کتابوں میں لکھ دی تھیں۔ سید احمد یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے اعتراضوں کا جواب لکھا جائے اور انگریزی زبان میں

لکھا جائے تاکہ سب کو اصل حقیقت معلوم ہو سکے۔ انگلستان جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا سید احمد انگلستان گئے وہاں بہت کچھ دیکھا۔ ایک نئی دنیا سامنے تھی جہاں کی ہر چیز نئی اور انوکھی تھی۔ تعلیم تھی نئے خیالات تھے شاندار اسکول کالج، اور یونیورسٹیاں تھیں۔ اخبار تھے، رسالے تھے، قومی ہمدردی اور ترقی کی دھن تھی۔ نظم وضبط تھا۔ سید احمد آئے تو انہوں نے نئے حوصلے اور لگن سے قومی خدمت کا کام شروع کیا۔ علی گڑھ میں ایک بہت بڑے کالج کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کا یہ کالج آگے چل کر مسلم یونیورسٹی بنا۔ لاکھوں مسلمان طالب علموں نے یہاں تعلیم حاصل کی اور ان طالب علموں نے بھی سید احمد کی طرح ملک و قوم کی خدمت کی۔ بڑے بڑے لوگ ہوئے مولانا محمد علی، شہید ملت لیاقت علی خان، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، مولوی عبدالحق۔ قائد اعظم محمد علی جناح مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اپنا قلعہ کہا کرتے تھے۔ پاکستان قائم کرنے میں اس یونیورسٹی کے طالب علموں اور استادوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ سید احمد کا یہی ایک کارنامہ اتنا شاندار اور اہم ہے کہ وہ اس کی بدولت ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ مگر انہوں نے قومی خدمت کے اور بھی بے شمار کام کئے۔

سید احمد نے تباہ و برباد اور غافل مسلمانوں کو جگایا۔ ہوشیار کیا، انہیں ایک قوم بنایا۔ یہ کہا کہ مسلمان ایک قوم ہیں۔ اس قوم کو دوسری قوموں کی طرح ترقی کرنا چاہئے۔ دوسری قوموں کے برابر آنا چاہئے۔ غفلت، جہالت، اور بُری رسموں کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اس خیال سے انہوں نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ بڑا اچھا رسالہ تھا۔ سید احمد نے خود بھی لکھا۔ لکھنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ صاف سادہ نثر کیسے لکھی جاتی ہے۔ لکھنے والوں کی ایک جماعت بھی تیار کر دی جس نے ان کے کام کو جاری رکھا۔ سید احمد اردو زبان کے بہت بڑے لکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے مضمون آج بھی بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

سید احمد کی پوری زندگی خدمت، محنت اور قومی ہمدردی میں گزری۔ کونسل کے رکن ہوئے تو وہاں مسلمانوں کی ترقی کے منصوبے پیش کئے

مسلمان بگڑ گئے

نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ رات کے دو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو میں نے سر سید احمد خان کو ان کے پلنگ پر نہ پایا باہر نکلا، تو دیکھتا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا: "کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے؟"

یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا "اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے ہی جا رہے ہیں"

(ماخوذ از حیات جاوید)

مرسلہ..... راحیلہ نرگس (؟)

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے ایک انجمن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، سارے ملک کے مسلمانوں کو تعلیم کا شوق دلایا۔ ان میں قومی احساس پیدا کیا۔ اسلام پر جو اعتراض ہو رہے تھے ان کا جواب بھی دیا اور ساری زندگی ناواقف ناسمجھ لوگوں کی مخالفت بھی برداشت کی۔ لوگ طرح طرح کے اعتراض کرتے تھے کیچڑ اچھالتے تھے مگر سید احمد نے ان باتوں کی کبھی کوئی پروا نہیں کی۔ بڑا آدمی، محنت سے کام کرنے والا، مخلص آدمی ایسی فضول باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ ویسے سید احمد بڑے زندہ دل اور خوش مزاج آدمی تھے۔

سید احمد کو بہادر شاہ نے جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب دیا تھا۔ انگریزی حکومت نے انہیں سر کا خطاب دیا۔ اس وجہ سے وہ سرسید کہلاتے ہیں۔ مگر اصل چیز خطاب نہیں کام ہے۔ سرسید کے کام اور ان کی یادگاریں مسلم یونیورسٹی، مضامین، تہذیب الاخلاق، خطبات احمدیہ (اس کتاب میں سرسید نے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور عیسائی عالموں کے جواب لکھے ہیں) اسباب بغاوت ہند۔ اور وہ قومی بیداری ہے جس نے ترقی کر کے پاکستان قائم کیا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو اکیاسی برس کی عمر میں سرسید اللہ تعالیٰ سے جا ملے اور یوں ان کی خدمتوں کا سلسلہ انجام کو پہنچا۔

سرسید احمد خان کی یادگاریں ملک کے ہر شہر میں ہیں۔ کراچی میں سرسید یونیورسٹی اور سرسید کالج ہے۔ سرسید روڈ ہے۔ پنڈی میں سرسید اسکول ہے۔ اسلام آباد میں سرسید ایونیو ہے۔ لاہور میں سرسید اسکول ہے۔ کراچی میں سائنٹفک سوسائٹی ہے۔ ہر طرف ان کے نام اور کام کی دھوم ہے۔ انہیں جدید اردو ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔ اور ان کے لکھے ہوئے مضامین اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نصاب کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ کیا آدمی تھے۔ آدمی نہیں روشنی کے مینار تھے۔

ہنستے ہنستے

منتخب لطائف

ایک گاہک دکان سے کپڑا خریدنے جاتا ہے۔

گاہک۔ "یہ فلیٹ کیا میٹر دی ہے؟"

دکاندار۔ "پندرہ روپے میٹر۔"

گاہک۔ "دس روپے میٹر دیجئے۔"

دکاندار۔ "بھائی دس روپے میٹر تو ہمیں گھر پر پڑتا ہے۔"

گاہک۔ "تو پھر آپ گھر کا پتہ ہی بتا دیجئے ہم گھر سے خرید لیں گے۔"

مرسلہ: نوید اختر، کراچی

○ ..... ○ .....

ہپی بال کٹوا رہا تھا۔ حجام نے بجائے قینچی کے مقناطیس اس کے بالوں پر پھیرنا شروع کر دیا۔ ہپی نے پوچھا۔ "یہ..... کیا کر رہے ہو؟"

"چپ رہو۔" حجام بولا۔ "میری قینچی تمہارے بالوں میں گم ہو گئی ہے۔"

مرسلہ: طیب احمد سکھر

○ ..... ○ .....

وکیل۔ (ڈاکٹر سے) "آپ کی ذرا سی غلطی آدمی کو چھ فٹ نیچے دفن کر سکتی ہے۔"

ڈاکٹر۔ "اور آپ کی ذرا سی غلطی آدمی کو چھ فٹ اوپر لٹکا سکتی ہے۔"

مرسلہ: ابراہیم خان، داود

○ ..... ○ .....

مریض۔ (دانتوں کے ڈاکٹر سے) ڈاکٹر صاحب آپ کئی دنوں سے میرے دانت نکال رہے ہیں اور ہمیشہ غلط دانت نکال دیتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ آج یقیناً صحیح دانت نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ کیونکہ اب آپ کے منہ میں ایک ہی دانت بچا ہے۔

مرسلہ: دلبر خان، کوئٹہ

..... ○ ..... ○ .....

ایک شخص ہوٹل کے بیرونی ہال سے باہر نکلنے سے پہلے اوور کوٹ پہن رہا تھا۔ دوسرے نے اس کے قریب آکر کہا۔ "معاف کیجئے گا..... کیا آپ فرید خان ہیں؟"

اس شخص نے پلٹ کر کہا۔ "جی نہیں..... مگر کیوں؟"

یونہی..... دراصل یہ اوور کوٹ فرید خان کا ہے..... اور وہ میں ہوں۔"

مرسلہ: رحمت اللہ، کوٹ ادّو

..... ○ ..... ○ .....

قیدی۔ (اپنے ملاقاتی وکیل سے) وکیل صاحب تنہائی سے میرا جی گھبرا گیا ہے۔ بات کرنے کو ترس گیا ہوں۔"

وکیل۔ "کیوں؟ کیا تمہارے گھر والے تم سے یہاں ملنے نہیں آتے؟"

قیدی۔ "وکیل صاحب افسوس کہ جیل میں ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت ہی کہاں دی جاتی ہے۔"

جنید اختر، کراچی

..... ○ ..... ○ .....

شاندار ہوٹل میں عمدہ اور قیمتی کھانا کھانے کے بعد ایک شخص نے بل ادا کرنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا۔ "میری جیب میں تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

یہ سن کر بیرا منیجر کے پاس پہنچا اور تمام حقیقت سے اسے آگاہ کر دیا۔ منیجر کو بہت غصہ آیا اور اس نے آکر اس شخص کی اچھی خاصی پٹائی کر ڈالی۔ مار کھانے کے بعد وہ شخص دروازے کی طرف جا رہا تھا کہ بیرے نے بڑھ کر دو مکے اور جڑ دیئے۔ منیجر نے بیرے کو ڈانٹا۔

"جب میں مار چکا ہوں تو تمہیں مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جی..... آپ نے اپنا بل وصول کر لیا تو میں اپنی ٹپ کیسے چھوڑ دیتا۔"

مرسلہ: حیدر علی، حیدر آباد

..... ○ ..... ○ .....

دو آدمی سڑک کے کنارے آپس میں لڑ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں چاقو..... اچانک ایک آدمی تیزی سے ان کے قریب آیا اور دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک پرچی تھما کر چلا گیا۔ دونوں بیک وقت اپنی اپنی پرچی کھول کر پڑھنے لگے جس پر لکھا تھا۔

"ہمارے کلینک پر گہرے سے گہرے زخم کا تسلی بخش علاج کیا جاتا ہے؟ اور یہ کلینک آپ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔"

مرسلہ: عمر سومرو، عمر کوٹ

..... ○ ..... ○ .....

ایک شخص نے ایک تھانیدار کی دعوت کی۔ وہ دو مرغ مسلم کھا گیا۔ کھانے کے بعد اسے ایک

بوڑھا مرغا صحن میں نظر آیا۔ اسے دیکھ کر تھانیدار بولا۔ "واہ..... دیکھو یہ مرغا کس شان سے چل رہا ہے۔"

میزبان نے جل کر جواب دیا۔ "شان کیوں نہ دکھائے ..... اس کے دو بیٹے ایک تھانیدار کی خدمت کر چکے ہیں۔"

مرسلہ: گل خان، پشاور

..... ○ ..... ○ .....

استاد۔ (شاگرد سے) فقرے میں استعمال کرو۔ "میرے منہ میں پانی بھر آیا۔"

شاگرد۔ "جب میں نے نلکے میں منہ لگایا تو میرے منہ میں پانی بھر آیا۔"

مرسلہ: بابر زمان، لاہور

..... ○ ..... ○ .....

باپ۔ (بیٹے سے) کیا تمام دن جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بے کار گھومنے سے گزارا ہو سکتا ہے؟

بیٹا۔ "جی ہاں ابا جان۔ اگر ہاتھ میرا اور جیب کسی اور کی ہو۔"

مرسلہ: آصف احمد، کراچی

.....○.....○.....

مقرر نے اپنی تقریر کے دوران حاضرین پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور پھر پوچھا۔ "فرض کریں کہ ایک برتن میں پانی ہے اور دوسرے میں شربت۔ دونوں برتن ایک پلیٹ فارم پر رکھے ہیں۔ اب میں ایک گدھے کو لاتا ہوں ..... بتائیے وہ دونوں میں سے کون سی چیز پسند کرے گا؟"

"ظاہر ہے وہ پانی ہی پیئے گا۔" ایک آواز آئی۔

"اچھا تو وہ پانی کو ترجیح کیوں دے گا؟" مقرر بولا۔

"اس لئے کہ وہ گدھا ہے۔" جواب آیا۔

مرسلہ: طاہر اکرام، کراچی

.....○.....○.....

ایک مولوی صاحب سینما کی برائیوں پر وعظ کرنا چاہتے تھے..... انہوں نے سوچا پہلے خود فلم دیکھ کر برائیوں سے واقفیت حاصل کی جائے انہوں نے سینما کے منیجر پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ منیجر نے خوش ہو کر بکنگ کلرک کو بلایا اور کہا۔ "انہیں گیلری کا ایک ٹکٹ دے دو اور یہ رقم پبلسٹی کے کھاتے میں ڈال دو۔"

مرسلہ: وجاہت، لاہور

بچّوں کیلئے انمول تحفہ

ڈرامے، گیت، مزاحیہ خاکے، خبریں، معلوماتی پروگرام اور بہت بہت کچھ

فن کار: ظل سبحان، نگہت بٹ، قاسم جیسی، جمشید انصاری، لطیف منا، نجیب اللہ انجم، شاہد اسماعیل اور بہت سے دوسرے۔
موسیقی: ارشد محمود، پروڈیوسر: ظفر محمود شیخ، ہدایات: سلیم مغل، اظہر نیاز!

ویڈیو میگزین

آنکھ مچولی

آج ہی طلب فرمایئے

قیمت: 150 روپے

Aankh Macholi Video Magazine

1 - PIB Colony Karachi

میرا حصّہ چھوڑو گی یا سارا خود ہی پی لو گی

یاسر بن منیر

آپ ایک حیرت کی بات سنیں گے ؟" سویڈن کے شہر اولینڈ میں ایک شخص نے چمپنزی پالا ہے۔"

"اس میں حیرت کی بات کیا ہے ! اکثر لوگوں کو جانور پالنے کا شوق ہوتا ہے۔ کوئی طوطے پالتا ہے، کوئی کبوتر، کچھ لوگ مرغیاں پالتے ہیں کچھ بطخیں۔ کسی گھر میں کتے پلتے ہیں، کسی میں بلیاں.... کہیں ایسے جانور پالے جاتے ہیں جن سے معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں مثلاً بھیڑ بکریاں، گائے بھینس وغیرہ اور کہیں ایسے جانور پالے جاتے ہیں جن سے مالی فوائد حاصل کرنا مقصد نہیں ہوتا۔" بالکل درست کہا آپ نے ! لیکن جس چمپنزی کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اسکی پرورش ذرا الگ ڈھب سے ہوئی ہے اور وہ ایسے کہ اس شخص نے چمپنزی کے بچے اور اپنی بیٹی کو بالکل اپنے بچوں کی طرح پالا ...وہ دونوں ہم عمر ہیں اور ایک دوسرے کو بہن بھائی سمجھتے ہیں... وہ ساتھ رہتے ساتھ کھیلتے اور ساتھ ہی کھاتے پیتے ہیں۔ آپ جو تصویر دیکھ رہے ہیں اس میں اولاد (چمپنزی) اپنی بہن الیگزینڈرا سے کہہ رہا ہے :

میرا حصّہ چھوڑو گی یا سارا خود ہی پی لو گی

امریکی قوم سے
شیطان کا
خطاب

تم سب میرے ہو

ریحانہ منیر

زمین تھرائی..... لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے.....

ہوا میں ارتعاش پیدا ہوا اور ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ فضا میں گونجا۔ لوگوں کی چیخوں کا شور، کنکروں، پتھروں کا ڈھیر اور دھویں کے بادل ایک ساتھ فضا میں بلند ہوئے۔ یہ ایک زمینی آفت تھی جو زلزلے کے روپ میں ظاہر ہوئی تھی۔ جو لوگ

زلزلے کے مرکز سے دور تھے، انہوں نے اس آفت سے بھی بڑی ایک بلا کو دیکھا دھویں کے جو بادل آتش فشاں پہاڑ سے نکل کر آسمان کی طرف گئے تھے، انہوں نے باقاعدہ ایک شکل اختیار کر لی ایک منحوس شکل۔ لمبے دانت، غار نما منہ، جھریوں بھرا چہرہ، اور مچی مچی آنکھیں، یہ شیطان تھا..... پھر لوگوں نے سنا کہ شیطان کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ مگر یہ بڑبڑاہٹ بہت واضح تھی۔

"جہنم میں جانے کو تیار ہو جاؤ..... میں تمہارا آقا ہوں..... تم سب میرے بندے ہو۔"

یہ یکم مارچ ۱۹۹۴ء کا قصہ ہے۔ امریکہ کی ریاست "سان جوز" میں زلزلہ آیا اور یہ ناقابل یقین منظر لوگوں نے دیکھا اور وہ منحوس آواز سنی۔ امریکی ہفت روزہ "ورلڈ نیوز" کے مطابق دو سو سینتیس افراد نے یہ منظر دیکھا اور آواز سنی۔ اس خبر کی اشاعت پر مختلف لوگوں کے مختلف خیالات بھی جریدے میں شائع ہوئے۔

ایک یونانی تاریخ دان نکوس پوکولس کے مطابق "انسانی تاریخ میں کئی ایسے مواقع آئے جب شیطان نے خود کو ظاہر کیا۔ جب دنیا میں جرائم، تشدد اور بد اخلاقی عام ہو جاتی ہے تو شیطان خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر آج اس نے انسانوں کو اپنا غلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو یہ کچھ زیادہ حیران کن بھی نہیں ہے۔"

بائبل کے ایک جرمن عالم کرٹ ویگنر نے شیطان کے اس دعوے کو جھوٹ اور دھوکہ قرار دیا ہے اس کا کہنا ہے کہ شیطان جانتا ہے کہ سوائے ان روحوں کے جو خود اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں وہ کسی انسان پر دعوے کا حق نہیں رکھتا۔

ایک فرانسیسی ماہر نفسیات کی رائے میں یہ آواز دراصل لوگوں کے اپنے اندر کی آواز تھی۔ انسان اپنے گناہوں اور بد اعمالیوں کی وجہ سے احساس گناہ میں مبتلا ہے۔ اور کسی بھی آسمانی یا زمینی آفت کے وقت اسے یہ احساس شدت سے ہونے لگتا ہے۔

ہمارے خیال میں مندرجہ بالا تمام آرا بھی درست ہیں اور شیطان کا دعویٰ بھی۔ آج کل امریکہ روئے زمین پر جس طرح فساد پھیلا رہا ہے۔ جس طرح مکر و فریب سے معصوم انسانوں کی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں وہ کوئی شیطان کا چیلا ہی کر سکتا ہے۔ ایسا شخص جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو جسے موت کے برحق ہونے کا یقین اور اللہ کے سامنے جواب دہی کا خوف لاحق ہو، وہ مخلوق خدا پر ظلم کے پہاڑ نہیں توڑ سکتا۔

اچھے ساتھیو! دراصل یہ خبر جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک امریکی مصنف کے ذہن کی اختراع ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ کہانی امریکی مصنف ہی کے ذہن میں کیوں بنی۔ ہمیں اس سلسلے میں فرانسیسی مصنف کی رائے بہت وزنی معلوم ہوتی ہے۔

آنگن

شبیر بیگ ناز

کافی کھلا کھلا ہے آنگن ہمارے گھر کا
لگتا ڈھلا ڈھلا ہے آنگن ہمارے گھر کا

بیری کا خوبصورت اک پیڑ بھی ہے اس میں
خوش رنگ میٹھے میٹھے لگتے ہیں بیر جس میں

شاداب گھاس اس میں کچھ اس طرح اُگی ہے
جیسے کہ سبز رنگ کی چادر بچھی ہوئی ہے

جب بج رہے ہوں باہر شادی کے شادیانے
لگتے ہیں اس میں اس دم رنگین شامیانے

جب ڈھل گئے ہوں سائے اور چل رہی ہو پُروا
آتا ہے لطف بے حد آنگن میں بیٹھنے کا

ہے شکر اس خدا کا جس نے مکاں دیا ہے
اور اس مکاں کے اندر آنگن بنا ہوا ہے

"اہلِ فلیٹ" کو ہے حاصل کہاں یہ نعمت
ان کے نصیب میں ہے شامل کہاں یہ دولت

آمنے سامنے

اسٹار کھلاڑیوں سے سوال جواب کا دلچسپ سلسلہ

سلیم خالق

"آمنے سامنے" کے اس ماہ کے مہمان اسنوکر کے عالمی چیمپئن "محمد یوسف" تھے مگر وہ ان دنوں کراچی میں نہیں ہیں۔ شاید اپنی فتح کا جشن منانے گئے ہوئے ہوں۔ اب وہ اپریل میں "آمنے سامنے" کے مہمان ہوں گے۔ آج کی محفل میں آپ کی ملاقات انضمام الحق سے ہوتی ہے۔ ان کے لئے ہم نے پچھلے سال اگست سے پہلے سوالات منگوائے تھے۔ جس کے بعد ہی خطوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی کہ بچے انضمام انکل کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ انضمام سے جوابات کافی پہلے لے لئے گئے تھے مگر آسٹریلیا و جنوبی افریقہ کے کھلاڑیوں کے انٹرویوز کی وجہ سے انضمام والا "آمنے سامنے" روکنا پڑا۔ اب اچھا موقع ہے اس لئے انضمام الحق کے جوابات حاضر ہیں۔

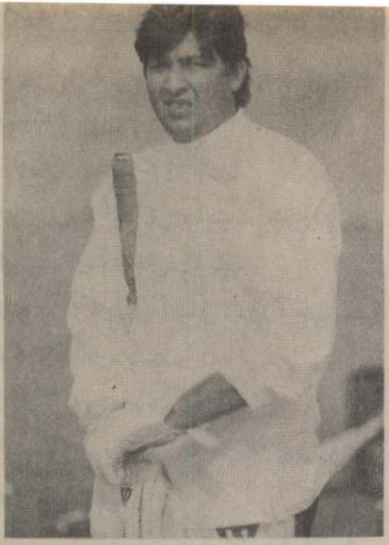

بڑبڑاتے رہتے ہیں؟

(ناہید اختر، لاہور، ارم آنچل، سوہاوہ)

انضمام الحق:۔ جی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بیٹنگ کرتے ہوئے بڑ بڑاتا نہیں ہوں۔ دراصل میں چیونگم کھاتا ہوں۔ اسی لئے منہ چلتا رہتا ہے اور آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بڑبڑا رہا ہوں۔

سوال:۔ اگر آپ کو الہ دین کا چراغ ملے جو آپ کی کوئی بھی ایک خواہش پوری کرے تو آپ اس سے کیا مانگیں گے؟

(حمیرا میر، وزیر آباد)

انضمام الحق:۔ یہ سائنسی دور ہے۔ اب جادو کے چراغ وغیرہ کہاں ہیں۔ اب تو کمپیوٹرز کا زمانہ ہے۔

سوال: آپ ورلڈ کپ کے سیمی فائینل میں کیا کھا کر گئے تھے سچ سچ بتائیے گا؟

(رانا محمد شاہد پپو، بورے والا)

انضمام الحق:۔ کوئی ایسی خاص چیز کھا کر نہیں گیا تھا۔ ویسے بھی اس دن میرا پیٹ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

سوال:۔ انضمام بھائی آپ کو اپنے گھر والوں میں سے سب سے زیادہ کون اچھا لگتا ہے؟

(خرم فاروق، کوجرانوالہ)

انضمام الحق:۔ سب ہی اچھے لگتے ہیں کسی ایک کا نام لوں گا تو باقی ناراض ہوں گے۔

سوال:۔ آپ نے ورلڈ کپ میں عمدہ کارکردگی دکھائی تھی مگر بعد میں آپ اچھا نہیں کھیلے اس کی کیا وجہ ہے؟

(حافظ حذیفہ صدیق قادری، ملتان، عبدالقدیر انڈھڑ، پنوں عاقل، اسد احمد، کراچی)

انضمام الحق:۔ اللہ کا شکر ہے کہ ورلڈ کپ میں اور ورلڈ کپ کے بعد میری کارکردگی اچھی رہی ہے۔ کوئی کھلاڑی ہر میچ میں تو رنز نہیں کر سکتا ہے۔ آپ کی اس بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ کہ ورلڈ کپ کے بعد میں اچھا نہیں کھیلا ہوں۔

سوال:۔ کچھ لوگ دھوکہ دے کر مسکراتے ہیں اور کچھ دھوکہ کھا کر آپ کب مسکراتے ہیں؟

(شہزادہ محمد صدیق، گجرات)

انضمام الحق:۔ شہزادے میاں، ہم تو ویسے ہی زیادہ

ترمسکراتے رہتے ہیں۔

سوال:۔ جب آپ صفر پر آوٹ ہوتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟

(رضوان اکرم، رحیم یار خان)

انضمام الحق:۔ اچھا نہیں ہوتا ہے کرکٹ بائی چانس گیم ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

سوال:۔ انضمام الحق آپ کی زندگی کا سب سے یادگار واقعہ کون سا ہے۔

(مولا بخش بلوچ، ساجن گوٹھ)

انضمام الحق:۔ ورلڈ کپ ۱۹۹۲ جیتنا میری زندگی کا یادگار واقعہ ہے۔

سوال:۔ آپ ہر وقت چیونگم کیوں چباتے رہتے ہیں؟

(سید محمد عابد حسن زیدی، پرانا سکھر، محمد جنید ہارون لاکھانی، کراچی، محمد امین، راولپنڈی، شیر علی ۹)

انضمام الحق:۔ بس کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میری عادت ہے۔ ویسے اگر آپ لوگوں کو میرا چیونگم چبانا پسند نہیں ہے تو بتایئے۔ نہیں چباؤں گا۔

سوال:۔ آپ کا نام اتنا مشکل کیوں ہے آپ کا نام لیتے ہوئے لگتا ہے کہ جیسے ہم الجبرے کا کوئی سوال حل کر رہے ہیں؟

(جاوید اقبال کنوری، حیدر آباد)

انضمام الحق:۔ یار میرا نام اب اتنا بھی مشکل نہیں ہے جتنا آپ لوگوں نے مشہور کیا ہوا ہے ویسے لگتا ہے کہ آپ الجبرے میں کمزور ہیں تبھی آپ نے ایسا کہا ہے۔

سوال:۔ سنا ہے کہ آپ زیادہ تر وقت سوتے ہوئے، اچھے اچھے خواب دیکھتے ہوئے گزارتے ہیں؟

(راحیلہ نرگس، کراچی، زاہد علی روبی ملتان، کتھری محمد فاروق، کراچی، فوزیہ نورین، خانیوال)

انضمام الحق:۔ سنی سنائی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کرنا چاہئے۔

سوال:۔ اکثر کھلاڑی تو قومی ٹیم میں شامل ہونے کے بعد صحت پکڑتے ہیں آپ ماشاء اللہ پہلے سے ہی خاصے صحت مند ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

(محمد کاشف شیخ، کراچی، ایاز حسین، کراچی، فریحہ، جیکب آباد، موش اظہر ڈار، گوجرانوالہ، ہما نقوی، گڈو بیراج)

انضمام الحق:۔ اس کی وجہ بہر کیف ملتان کا سوہن حلوہ تو نہیں ہے بس اللہ کی دین ہے۔

سوال:۔ جب آپ آوٹ ہو کر پویلین کی طرف جاتے ہیں تو روتے کیوں ہیں؟ کیا آپ بہت کم ہمت ہیں؟

(شہلا مریق، ٹنڈو آدم)

انضمام الحق:۔ آوٹ ہونے کے بعد روتا تو نہیں ہوں۔ بہر حال افسوس تو ہوتا ہے آؤٹ ہونے کا۔ اس وجہ سے افسردگی سے واپس پویلین کی طرف جاتا ہوں اور آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں رو رہا ہوں۔ ■

سوال:۔ اگر مجھ جیسا غریب پرستار آپ کو دعوت پر بلائے تو کیا آپ آئیں گے؟
(عمر خوشنود، لاہور)

انضمام الحق:۔ عمر صاحب، میرے لئے میرے تمام پرستار برابر ہیں۔ غریب یا امیر ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ دعوت میں آنے کے لئے میں تیار ہوں۔ بس ذرا سیزن آف ہونے دیں۔ پھر جب میں لاہور آؤں گا۔ تو آپ کی دعوت ضرور کھاؤں گا۔

سوال:۔ انضمام بھائی آپ اپنے کیریئر کی سب سے یادگار اننگ کون سی سمجھتے ہیں؟
(محمد ذیشان ارشد، ابوظہبی، متحدہ عرب امارات)

انضمام الحق:۔ میرے خیال میں ورلڈ کپ ۱۹۹۲ کے سیمی فائنل والی اننگ میرے کیریئر کی بہترین اننگ ہے۔

جنوبی کوریا میں سانپ کھائے جاتے ہیں

مرسلہ: عبدالستار خان طاہر، بوریوالہ۔

جنوبی کوریا کے دارالحکومت سیول کے تقریباً چار سو چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں اور کینٹینوں میں جو کھانا سب سے زیادہ اور دلچسپی سے تیار کیا جاتا ہے۔ وہ سانپ ہے۔ سانپ مختلف طریقوں سے پکایا جاتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ غیر ملکی سیاحوں میں بھی سانپ نے بطور غذا مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ ہوٹلوں اور کینٹینوں کے باہر خوشنما کیسوں میں سلنڈروں کی شکل کی کانچ کی بوتلیں رکھی ہوتی ہیں جن میں زندہ سانپ بل کھا رہے ہوتے ہیں۔ یہ بوتلیں گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے باہر رکھی جاتی ہیں۔ جنوبی کوریا کی حکومت نے اپنے دارالحکومت کو خوبصورت بنانے کے لئے سانپ پکانے والے ہوٹلوں سے کہا ہے کہ وہ شہر کی بڑی سڑکوں سے گلیوں میں منتقل ہو جائیں کیونکہ بعض غیر ملکی لوگ سانپوں کو پسند نہیں کرتے۔ پکے ہوئے سانپ بیچنے والے اس "عجیب و غریب" حکم کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے (جو بیشتر عام ہے) کہ سانپ بطور غذا بہت سے امراض کا علاج ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سانپ دیکھنے میں بعض لوگوں کو اچھا نہیں لگتا لیکن غیر ملکی لوگ اس کا پکا ہوا گوشت رغبت سے کھاتے ہیں۔ پکا ہوا سانپ سستا نہیں ملتا۔ سانپ کی یخنی کا ایک پیالہ دو سو روپے سے سولہ سو روپے تک ملتا ہے۔ قیمت کی کمی سانپوں کی قسموں کے مطابق ہوتی ہے۔ سانپوں کے ماہرین کہتے ہیں کہ سانپ کی یخنی کا ایک پیالہ روزانہ دس دنوں تک پیا جائے تو جسم کی مشینری سو فیصد درست ہو جاتی ہے۔

"وائپر" (VIPER) غالباً سب سے زیادہ زہریلا سانپ ہے اس کی یخنی کے ایک پیالے کی قیمت چودہ سو روپے ہے۔ یہ اعصابی دردوں اور تپ دق کے لئے اکسیر ہے۔ سانپوں کی ایک قسم ایسی ہے جس کی یخنی سے ساری زندگی انسان کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ یہ ایک زندہ سانپ چالیس ہزار سے ساٹھ ہزار روپے تک ملتا ہے۔ اس کی لمبائی ڈیڑھ فٹ ہوتی ہے۔ کوریا کا امیر باشندہ بھی ایک سال میں خوراک پر چالیس ہزار روپے خرچ نہیں کر سکتا۔ لیکن سانپوں کی یخنی کے متعلق یقین سے کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی صحت کو ہمیشہ کے لئے ہشاش بشاش رکھتی ہے۔

سلام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوں کے جواب

طاہر ناز انصاری، دینہ شہر۔ فروری کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لطیفے مزے دار تھے۔ نظمیں بھی پسند آئیں۔ **تنویر حسین، کراچی۔** فروری کا سرورق شاندار تھا۔ کہانیوں میں "وہ کیا راز تھا؟" اور "میرے چچا جان سے بچاؤ" اچھی تھیں۔ **عاقب جاوید** کا انٹرویو پسند آیا۔ **محمد بلال تاج، کراچی۔** تازہ شمارے میں "قصہ ایک ناک کا" بہت اچھی لگی۔ "ننھا موجد" بھی اچھا مضمون تھا۔ "سوتا جاگتا ابوالحسن" اور "وہ کیا راز تھا" سلسلے اچھے جارہے ہیں۔ آپ اس رسالے کے صفحات ذرا سے بڑھادیں..... پلیز!! **عمر فاروق، ملتان۔** "سوتا جاگتا ابوالحسن" (ڈرامہ) بہت پسند آیا۔ **ارشد اقبال، سکھر۔ شوکت ناز بلوچ، بلوچستان۔** عادل منہاج کی کہانی نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہمارے پسندیدہ مصنف ہیں۔ **فوزیہ علوی، پٹارو۔** رسالہ تاخیر سے ملا۔ سرورق پسند نہیں آیا۔ کہانیاں بھی اس بار خاص نہیں تھیں۔ البتہ نظمیں ساری اچھی لگیں۔ **محمد عمران خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔** آنکھ مچولی جس طرح بچوں کی اصلاح کررہا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ **عدیل ستار، کراچی۔** "سوتا جاگتا ابوالحسن" "ننھا موجد" اور "چور پکڑا گیا" بہت اچھی تحریریں تھیں۔ **محمد ذاکر، محمد شاکر، کراچی۔** آنکھ مچولی بہت پسند آیا۔ **فوزیہ ودود، کراچی۔** پہلی بار خط بھیج رہی ہوں۔ امید ہے میری تحریر ضرور

شائع کریں گے۔ ○ ------ بی بی! آپ کوئی اور اچھی سی تحریر بھیجئے یہ تو آنکھ مچولی کے معیار پر پوری نہیں اتری۔ **سید کاشان، فرحان، کامران، حیدر آباد۔** شمارہ پڑھا دل باغ باغ ہوگیا۔ سرورق بہت شاندار تھا۔ کہانیاں سبھی اچھی تھیں۔ **اعجاز فاطمہ، آمنہ خاتون، کراچی۔** "واپسی اپنوں ہی میں" "چور پکڑا گیا" "وہ کیا راز تھا" اور "اداکار بھوت" اچھی کہانیاں تھیں۔ **عباس حسین، کراچی۔** تازہ شمارے میں "نافرمان لڑکے کی سزا" "کبھی اپنے ماموں کراچی جو آئیں" "پیارے ابا جان روزہ آپ کیوں نہیں رکھتے" جیسی نظمیں پسند آئیں۔ **سید عمران علی زیدی، حیدر آباد۔** فروری کے آنکھ مچولی میں تمام تحریریں اچھی تھیں خاص طور پر "گری تھی مجھ پر کل بجلی" اور "جادوئی گولا گھر گھر بولا" جیسے تفریحی اور معلوماتی صفحات نے رسالے کو چار چاند لگادیئے۔ **سمیر خان، لاڑکانہ۔** پہلی بار آنکھ مچولی پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ اس کے معلوماتی مضامین، پیاری کہانیاں اور انعامی مقابلے بہت ہی اچھے لگے۔ قسط وار کہانی بھی پسند آئی۔ **عابد حسین چانڈیو، لاڑکانہ۔** جناب عبدالقادر اور جناب حسن عابدی صاحب کی نظمیں بہت پسند آئیں۔ قلم دوست کے لئے کچھ چیزیں بھیج رہا ہوں۔ ○ ------ آپ کی ایک تحریر اس بار قلم دوست میں شامل کی گئی ہے۔ **عبدالقدیر انڈھڑ، پنوں عاقل، سائرہ سعید، کراچی۔** قسط وار ڈرامہ "سوتا جاگتا ابوالحسن" بہت اچھا جارہا ہے۔ **ذیشان احمد، خوشاب۔** فروری کا شمارہ اپنی مثال آپ ہے۔ "وہ کیا راز تھا" بہت اچھی چل رہی ہے..... مجموعی طور پر شمارہ بہت پسند آیا۔ **ضیاء الحسن ضیا، کراچی۔** اکتوبر کے پرچے میں "مری پیاری کاغذ کی رنگین چڑیا" پر نظر ٹھہر گئی۔ یہ نظم کئی سال پہلے ہمدرد نونہال کراچی میں بچوں کے ایک اچھے شاعر محمد اقبال اثر نے لکھی تھی۔ ○ ------ محترم! اگر آپ اس نظم کا تراشہ بطور ثبوت بھجوادیں تو عنایت ہوگی۔ **فہیم حیدر، کراچی۔** شمارہ حسب روایت اچھا تھا۔ تمام تحریریں معیاری تھیں۔ **راحت صلاح الدین، کراچی۔** نومبر کے شمارے میں آپ نے میری کہانی "ظہران کا فیصلہ" شائع کی۔ ایک بار پھر میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی۔ ○ ------ بھئی! آپ کی کہانی تھی ہی بہت اچھی۔ اس کے لئے تو ہمیں آپ کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ **حمیرا جبین، شفاعت حسین، سیالکوٹ۔** سرورق بہترین تھا۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ ہم نے جب بھی خط بھیجا آپ نے نہیں چھاپا اس کی کیا وجہ ہے؟ ○ ------ اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ خط ہمیں نہیں ملا۔ **صائمہ قریشی، ڈیرہ غازی خان۔** دسمبر سے آنکھ مچولی پڑھنا شروع کیا ہے یہ واقعی بچوں کے لئے اچھا رسالہ ہے۔ **حمیرا ناز سرور، گجرانوالہ۔** اس ماہ کا آنکھ مچولی آفت تھا۔ تحریریں پسند آئیں۔ **محمد شاہد منتظر، بوریوالہ۔** "آمنے سامنے" میں آسٹریلین کھلاڑیوں سے ملاقات اچھی رہی۔ **محمد آصف جاوید، تونسہ شریف۔** ایک سال سے مسلسل خط لکھ کر تھک گیا ہوں مجال ہے جو کوئی خط چھپ جائے۔ ○ بھائی جاوید! ڈاک والوں کی مہربانی سے ہمیں بہت سارے دوستوں کی باتیں سننا ہی پڑتی ہیں۔ **عالم شفیع ہمدم، جھنگ۔** شمارہ معلومات سے بھرپور تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ کھلاڑیوں سے سوالات کا سلسلہ بہت اچھا جارہا ہے۔ **قرۃ العین**

[illegible] آباد۔ سرورق بہت پسند آیا تمام تحریریں لاجواب ہیں۔ **محمد بلال، سوات۔** آپ میری کوئی تحریر چھاپتے ہیں نہ کوئی جواب دیتے ہیں۔ ○ ۔۔۔۔ بھائی آپ کی اکثر تحریریں رسالے میں چھپتی رہتی ہیں۔ **محمد عثمان، جلالپور۔** میری کچھ تحریریں کافی عرصے سے آپ کے پاس ہیں ۔۔۔۔ رائے سے آگاہ فرمائیں۔ ○ ۔۔۔۔ آپ کی وہ تحریریں ناقابل اشاعت ہیں..... معیاری اور دلچسپ تحریریں ارسال کیجئے۔ **حمیرا کرن، اٹک۔** میں اپنی کچھ تحریریں بھیجنا چاہتی ہوں امید ہے چھاپ دیں گے۔ **پرنس افضل شاہین، بہاولنگر۔** شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں۔ **شیخ علی رضا قمر، پتوکی۔** سرورق نے آنکھ مچولی کو چار چاند لگادیئے۔ جناب عبدالقادر صاحب کی نظم تمام نظموں پر سبقت لے گئی۔ **زبیدہ کاظمی، چمبڑ (سندھ)۔** آپ اسٹیکر پر تصویریں اور نام چھاپتے ہیں کبھی کوئی چٹ پٹا لطیفہ، انعامی پہیلی، کوئی سبق آموز حکایت یا دلچسپ معلومات بھی چھاپ دیا کریں۔ ○ ۔۔۔۔۔ بھئی! یہ سب چیزیں تو آپ آنکھ مچولی میں ہی پڑھ لیتی ہیں۔ **میر عدیل، مظفر آباد۔** تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ سرورق جاذب نظر تھا لطائف مزے دار تھے۔ **محمد ابراہیم، تونسہ شریف۔** گذشتہ چار سال سے آنکھ مچولی کا خاموش قاری ہوں۔ آنکھ مچولی معیاری رسالہ ہے۔ پہلی بار خط لکھ رہا ہوں امید ہے ردی کی ٹوکری سے محفوظ رکھیں گے۔ **محمد محسن اعظم، مظفر آباد۔** شمارہ بہت پسند آیا۔ سرورق بھی غیر معمولی تھا۔ "سنہرے حروف" ہمیشہ کی طرح سبق آموز تھے۔ **نثار احمد جمالی، دادو۔** پہلی دفعہ آنکھ مچولی میں شرکت کر رہا ہوں امید ہے کہ مایوس نہیں کریں گے۔ **شہروز علی، گجرانوالہ۔** میں پہلے لاہور میں رہتا تھا۔ پھر بیلجیم چلا گیا جس کی وجہ سے رسالہ باقاعدگی سے نہ پڑھ سکا اب گجرانوالہ میں رہائش اختیار کی ہے۔ اگر میں آپ کو کوئی ڈراؤنی انگلش کہانی کا ترجمہ کرکے بھیجوں تو کیا آپ.....؟ ○ ۔۔۔۔ جی نہیں ہم نہیں ڈریں گے۔ شاید بچے ضرور ڈر جائیں خیر آپ بھیج دیجئے دلچسپ اور معیاری ہوا تو چھپ جائے گا۔ **اسماعیل سرسانہ، ملتان۔** "عکس ادھورے پورے" کو اب بند کردیجئے اور ہاں یہ بتائیے کہ آنکھ مچولی کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا اور اس کے ایڈیٹر کون تھے؟ **ممتاز علی، اللہ یار، کوئٹہ چھاؤنی۔** پہلی بار آنکھ مچولی پڑھا بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر "ماہ رواں کی پہلی بات" اور "سنہرے حروف" بہت پسند آئے۔ **راؤ شاہد علی، نیو ہالہ۔** کچھ تحریریں بھیج رہا ہوں۔ رائے سے آگاہ فرمائیں۔ ○ ۔۔۔۔ بھائی! آپ کی یہ تحریریں ناقابل اشاعت ہیں کوئی دلچسپ تحریر ارسال کیجئے۔ **محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔** میری تحریریں "غسان کا شہزادہ" اور "دوسرا فرض" کے بارے میں کچھ بتائیں۔ ○ ۔۔۔۔ آپ کی یہ دونوں تحریریں ناقابل اشاعت ہیں۔ **سمیع اللہ بلوچ، پسنی۔** آنکھ مچولی بہت دلچسپ اور مزیدار رسالہ ہے۔ **محمد معظم اعزاز، ملتان** کتنے ہی خط بھیجے ان میں سے گنتی ہی کے شائع ہوئے۔ ○ ۔۔۔۔۔ بھائی! دل چھوٹا نہ کیجئے تمام بچوں کی طرح آپ بھی ہمیں عزیز ہیں۔ **زبیدہ، سعید الحسن، جامپور۔** میں آپ کو کچھ تحریریں بھیج رہی ہوں کیا آپ ان کو شائع کردیں گے؟ ○ ۔۔۔۔ بھئی دلچسپ اور معیاری تحریریں

ارسال کیجئے یہ تو ردی کی ٹوکری نے پسند کرلی ہیں۔ **ہما نقوی، گڈو۔** آنکھ مچولی جب ملا اس وقت میں کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ آمنے سامنے پڑھتے پڑھتے میری چیخ نکل گئی۔ امی سمجھیں میرا ہاتھ جل گیا ہے لیکن میرا تو سوال انعامی قرار پایا تھا۔ شکریہ! ○ ---- ہم بھی ڈر گئے..... شکر ہے کہ آپ کا ہاتھ نہیں جلا۔ **زغیب، پشاور۔** آنکھ مچولی کا شمارہ ملا کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ **رحمت اللہ بشیر، گجرات۔** اس ماہ کا آنکھ مچولی لاجواب تھا۔ تمام کہانیوں نے خوب مزہ دیا۔ **مجیب ربانی، سرائے سدھو۔** ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ عبدالقادر صاحب کی نظم بہت اثر انگیز تھی۔ ان سے کبھی ملاقات کروائیں۔ **عبداللہ شان، رند کالونی۔** سلسلہ وار ڈرامہ "سوتا جاگتا ابوالحسن" بہت پسند آیا۔ **شرمین ثروت، کراچی۔** آنکھ مچولی نظروں سے گزرا دوسرے رسالوں کی نسبت بہت اچھا لگا۔ **محمد حسنین شہاب، تونسہ شریف۔** بنام آنکھ مچولی میں اپنا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ "پہلی بات" پہلے کی طرح منفرد تھی۔ نظمیں کہانیاں پسند آئیں۔ "وہ کیا راز تھا" سنسنی پھیلائے ہوئے ہے۔ قلم دوست میں بھی اچھی تحریریں تھیں۔ **خالد اسد، سری پور۔** تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ **اصغر علی، جیکب آباد۔** شمارہ اچھا لگا۔ **ہارون اقبال، میرپور خاص۔** باقاعدگی سے آنکھ مچولی پڑھتا ہوں لیکن شرکت پہلی دفعہ کر رہا ہوں۔ **راشد آدم، سونمیانی۔** رسالہ ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ "سوتا جاگتا ابوالحسن" سب پر بازی لے گیا۔ ذہنی آزمائش کا نیا سلسلہ "اب میں کیا کروں؟" بہت پسند آیا۔ **خلیق الرحمٰن، ایبٹ آباد۔** "وہ کیا راز تھا؟" پہلے پڑھی۔ اس کا مزاحیہ انداز پسند آیا۔ **فرحت زہرہ، کراچی۔** تین سال سے آنکھ مچولی پڑھ رہی ہوں لیکن آپ نے کبھی میری کوئی تحریر نہیں چھاپی.....! ○ ---- بھئی! مایوسی کفر ہے آپ معیاری اور دلچسپ تحریریں ارسال کیجئے ضرور چھپیں گی۔ **کاشف اسماعیل، ملتان۔** سرورق کا نرالا انداز پسند آیا۔ سب کہانیاں اچھی تھیں۔ کوئی نیا انعامی سلسلہ شروع کریں۔ ○ ---- بھائی کاشف! نئے سال سے اتنے سارے انوکھے انعامی سلسلے شروع تو کئے گئے ہیں آپ کے ذہن میں بھی کوئی منفرد اور اچھوتا آئیڈیا ہو تو ضرور بتائیے۔ **شمس الدین التمش، دوآبہ۔** شمارہ دھڑکتے دل کے ساتھ کھولا کہانیاں اور مضامین دلچسپ تھے۔ **راجہ امتیاز حسین، لالہ زار۔** انکل! چھوٹے بچوں کے لئے ایک ناول بڑی محنت سے لکھا ہے کیا آپ اسے شائع کرانے میں میری مدد کریں گے؟ ○ ---- راجہ بھائی! راولپنڈی میں کافی سارے اشاعتی ادارے ہیں آپ کسی اچھے پبلشر سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ **کاشف جمیل، تربت۔ محمد عادل** منہاج کا پتہ درکار ہے۔ کیا آپ.....؟ ○ ---- آپ عادل کو آنکھ مچولی کی معرفت خط لکھ سکتے ہیں۔ **رانا محمد ارشد خان، کمالیہ۔** "وہ کیا راز تھا؟" پڑھنے کو ملی۔ پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا مضمون پڑھ کر مزہ آیا۔ اس طرح اپنے بزرگوں کے شاندار کارناموں کے بارے میں نوجوان نسل کو پتا چل سکے گا۔ **سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی۔** ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ تحریریں اچھی لگیں۔ **شہر بانو بخاری، راشد، رحیم یار خان۔** کیا آپ کی بخاری فیملی سے کوئی دشمنی ہے جو ہم بہن بھائیوں کی تحریریں نہیں چھاپتے؟

اب میں کیا کروں؟

اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے مگر پھر بھی میں اپنے آپ کو ایک بدنصیب بچی سمجھتی ہوں۔ میرے ابو اور امی دونوں ملازمت کرتے ہیں۔ ان دونوں کا خیال ہے کہ ہم بچوں کو صرف عیش و آرام کا سامان چاہئے۔ انہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ہمیں پیسہ نہیں پیار چاہئے، ان کی توجہ چاہئے۔ ابو دفتر سے لوٹتے ہیں تو چڑچڑے نظر آتے ہیں۔ امی واپس آتیں ہیں تو تھکی ہوتی ہیں۔ گھر آکر بھی انہیں دفتری باتوں سے فرصت نہیں ملتی۔ میرے دوسرے بھائی بہنوں نے تو اپنی اپنی مصروفیات ڈھونڈ رکھی ہیں لیکن میں ذرا حساس ہوں، اندر ہی اندر کڑھتی رہتی ہوں اور اپنے دل کا حال کہنے کی ہمت بھی نہیں پڑتی پھر کہہ بھی دوں گی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ ابو امی کے پاس ہمارے لئے وقت ہوتا تو یہ شکایت ہی کیوں پیدا ہوتی۔ ایک آدھ بار میں نے کہا بھی کہ امی آپ گھر پر رہا کریں تو امی خفا ہو گئیں..... بھلا بتایئے میں کیا کروں..... مجھے تو یہی لگتا ہے کہ ابو امی کی زندگی میں ہم یتیم ہیں۔

(ع۔ ا۔ گڈو، سندھ۔)

فروری کے شمارے میں لاہور کے ایک ساتھی پ'م کا مسئلہ پیش کیا گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ گھر سے پیسے چرانے کی عادت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی اس عادت سے تنگ بھی ہیں مگر ان کے دوستوں کا حلقہ ایسا ہے کہ اگر پیسے پاس نہ ہوں تو وہ کنجوس ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ والد صاحب جو جیب خرچ دیتے ہیں وہ فوراً" ختم ہو جاتا ہے۔ والد صاحب جیب خرچ میں اضافہ نہیں کریں گے۔ دوستوں کو چھوڑنا ممکن نظر نہیں آتا۔ کریں تو کیا اور جائیں تو کہاں؟۔۔۔۔۔ اس مسئلے کے سلسلے میں ہمیں ساتھیوں کے بھیجے ہوئے مشورے ابھی تک موصول ہو رہے ہیں رسالہ پریس میں جا رہا ہے

اسی لئے بعد میں آنے والے مشورے شامل نہیں ہو سکیں گے۔ ساتھیوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مشورے ۵ مارچ تک ادارہ آنکھ مچولی کو ضرور بھیج دیں۔۔۔۔ پ م کے مسئلے کے سلسلے میں جو مشورے موصول ہوئے ہیں' ان میں سے چند قابل ذکر مشوروں کی جھلکیاں یہ ہیں۔

سحر شیخ' نواب شاہ۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کو برے لڑکوں سے دوستی ختم کر دینی چاہئے۔ مقولہ مشہور ہے کہ "برے دوستوں سے تنہائی بہتر ہے۔"

عالم شفیع ہمدم' جھنگ۔ پ م صاحب۔ سب سے پہلے تو آپ پانچ وقت کی نماز پڑھیں۔ کیونکہ نماز برے کاموں سے روکتی ہے اور پھر عہد کر لیں کہ پیسے کبھی نہیں چرائیں گے اور ہر حال میں سچ بولیں گے۔ والد صاحب کو ساری صورت حال بتا دیں اور ان سے مہینے کے بجائے روزانہ کا جیب خرچ لیا کریں۔

فائز احمد' کراچی۔ میری رائے ہے کہ پ م اپنی قوت ارادی مضبوط کریں اور فیصلہ کر لیں کہ جیب خرچ سے ایک پیسہ فالتو خرچ نہیں کریں گے۔ اور دوستوں کو بھی صاف صاف بتا دیں۔ دوست یہ دیکھ کر اپنی راہ لیں گے۔ یہ دوست نہیں' دوست نما دشمن ہیں۔

عبدالقدیر انڈھڑ۔ پنوں عاقل کینٹ۔ پ م کو چاہئے کہ اپنے ابو' امی اور بھائی بہنوں کو اپنی بری عادت سے آگاہ کر دیں۔۔۔۔ اور پھر آئندہ اس عادت سے توبہ کر لیں۔

سائرہ سعید' ڈرگ روڈ کراچی۔ انسان کی بری یا اچھی عادتیں اس کے اپنے اختیار میں ہوتی ہیں۔ اگر پ م چوری کی عادت چھوڑنے کا ارادہ کر لیں تو انہیں ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ اس کے لئے انہیں اپنے برے دوستوں کی صحبت کو چھوڑنا ہوگا۔ ان کی برائی کی جڑ ان کے برے دوستوں کا حلقہ ہے۔ اور یہ تو وہ لڑکے ہیں جو دوست کہلانے کے مستحق نہیں۔

محمد حسن سروش' نواب شاہ۔ جرم کتنی ہی ہوشیاری سے کیا جائے ایک دن پکڑا ہی جاتا ہے۔ اور اگر دنیا والوں سے بچ گئے تو بھی آخرت میں اس کی پکڑ ہوگی۔ بھائی پ م کو چاہئے کہ بجائے اس کے کہ وہ دوستوں کی راہ پر چلیں' انہیں دوستوں کو نیک راہ پر چلانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ انہیں اپنے دوستوں کو سمجھانا چاہئے کہ فضول خرچی اور عیش پرستی میں صرف تباہی ہے۔

سید علی عمران زیدی' حیدر آباد۔ ۱۔ پ م کو بے کار دوستوں سے دوستی ختم کرنی ہوگی۔

۲۔ ان کو اپنے خرچیلے پن پر قابو پانا ہوگا۔

۳۔ جیب خرچ کو صحیح استعمال میں لانا ہوگا۔

انعام یافتہ حل

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز اگر مقتول کے ورثا ' قاتل کو معاف کردیں گے تو خدا بھی معاف کردے گا مگر چوری ایک ایسا جرم ہے کہ اگر چور کو معاف کر بھی دیا گیا تو خدا کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اسی حدیث سے سبق ملا کہ چوری قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔ ایک ایسا جرم جس کے کرنے پر چور کے دونوں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ پ م کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ انہیں یہ بھی خدشہ ہے کہ اگر ان کی چوری کی عادت کا علم گھر والوں کو ہوگیا تو کتنی بے عزتی ہوگی۔ لیکن ان کو اس کا احساس نہیں کہ خدا جو ان کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا ہے' قیامت کے دن وہ اسی خدا کا سامنا کیسے کریں گے؟ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آپ چور بن چکے ہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ برے دوستوں کے ایسے حلقے میں پھنس چکے ہیں جو آپ کو چوری جیسی ذلیل عادت میں مبتلا کرنے کا باعث بنے۔ جنہوں نے آپ کو کنجوس مکھی چوس کا خطاب دے کر بہنوں کے پرس میں ہاتھ ڈالنے پر مجبور کردیا۔ ایسے لالچی اور خود غرض دوستوں کے لئے آپ اپنے پیار کرنے والی بہنوں اور دکھ اٹھانے والے والدین کو دھوکا دینے اور ان ہی کو لوٹنے کی گندگی میں گر چکے ہیں۔ اگر آپ اپنی عادت سے واقعی نجات چاہتے ہیں تو پھر آپ کو ایک کڑا فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ اپنے دوستوں کو چھوڑ دینے کا فیصلہ۔ بیماری جتنی پرانی ہوتی ہے' دوا اتنی ہی کڑوی پینی پڑتی ہے۔ آپ کو ارگرد کئی مخلص اور اچھے دوست مل جائیں گے لیکن برے دوستوں کی صحبت میں پڑ کر آپ اپنی زندگی تباہ کرلیں گے۔ آپ کا کہنا ہے کہ آپ کا جیب خرچ اتنا کم ہے کہ ایک ماہ کا جیب خرچ ایک ہفتے میں ختم ہوجاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ چوری کے ساتھ ساتھ فضول خرچی کی عادت میں بھی مبتلا ہیں۔ آپ کے اور بھائی بہن بھی تو ہیں' انہیں اس بات کی شکایت کیوں نہیں۔ فضول خرچی کی عادت پر قابو پائیے۔۔۔ ۔۔اور ہاں ایک بات اور۔۔ کیا آپ نماز پڑھتے ہیں؟ اگر نہیں تو نماز شروع کردیجئے۔۔۔ جب آپ باوضو ہو کر خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے تو وہ مالک حقیقی بھی آپ کو نیک کاموں کی توفیق دے گا۔۔۔ اور آپ سیدھی راہ پر چل پڑیں گے۔ انشاء اللہ

(شبانہ حنیف۔ ٹنڈو آدم)

آنکھ مچولی البم

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابل اشاعت تحریروں کا کالم

"میرے وطن کے لوگو!" محمد عدنان عبدالعزیز، کراچی۔ "میرامہرا اسلام ہے" ساجد، پسنی۔ "میں اسکول نہیں جاؤں گا" محمد جنید ہارون، کراچی۔ "سات پریاں" سرفراز اختر، فیصل آباد۔ "تخریب کار" نواز افتخار بیگ، کراچی۔ "جمہوریت" خالد اکرم شیخ، کراچی۔ "بلاعنوان" فرسان منظور خان، کراچی۔ "نوجوان مستقبل کا" محمد عثمان، اٹک۔ "طوطے کا کارنامہ" "خدائی مالٹے" عفیفہ اطہر، گدو، حیدر آباد۔ "باعمل بانصیب" سید زاہد حسین شاہ، چکوال۔ "پڈنگ کا مزہ" سیدہ افشاں افتخار، کراچی۔ "بلیک کوبرا" آصف بشیر لاہور۔ "انوکھی سزا" راحیل احمد (؟) "شہزادی زرقا" عاصم شہزاد۔ آزاد کشمیر۔ "محمد بن قاسم" واصف آدیب، لاہور۔

"پاکستان" فائزہ احمد، کراچی۔ "ناقابل فراموش نیکی" محمد سعید سرور، پتوکی۔ "نظم" فاطمہ قریشی، پشاور۔ "بجلی کا بلب کیسے جلتا ہے" مقبول احمد مغل، کسووال۔ "چھوٹا قد کیوں ہوتا ہے" ساجد محمود ساجد، مخدوم پور۔ "پیپ بینار" سید محمد اطہر حسین، کراچی۔ "شہزادی ماریہ" "منگو بندر" سارہ شریف بیگ، لاہور۔ "دایاں ہاتھ" رانا محمد شاہد بورے والہ۔ "کشمیر" سلمان مراد، کراچی۔ "پرانا قلعہ" عاصم شہزاد، میرپور۔ "ندامت کے آنسو" آسیہ بشیر لاہور۔ "شیر کا گھر" محمد فواد آصف، ملتان۔ "میں اور میرا کتا" نسرین ناز ابڑو، ڈہرکی۔ "کردار کی اہمیت" "نعت" عبدالقدیر انڈہٹر، پنوں عاقل۔ "خواب یا حقیقت" خرم ثناءاللہ، کراچی۔ "دودھ پانی" علی شیرو گن، نواب شاہ۔ "اک تمنا" عماد حسین یاد، لاہور۔ "شیر اور انسان" عجیب اللہ عباسی، بنگورو۔ "ماں" اورنگ زیب، ٹنڈو محمد خان۔ "موسم" صائمہ یسین، نارتھ کراچی۔ "آج کا پیاساکوا" "چھ ماہ قبر میں" اکبر علی شاہد، فیصل آباد۔ "غم شام" ذہنی وقار، خانیوال۔ "طفل مکتب" عماد حسین یاد، لاہور۔ "شرفا کی گفتگو" ماہین رضوی، کراچی۔

"حمد" سیف الرحمٰن، رحمت آباد۔ "بہت ہی خاص بچہ" "مداوا" "شریر لڑکے کی صدا" نوید احمد مجید، کراچی۔ "صدی کی شام" محمد ریحان، اسلام آباد۔ "ضمیر کا فیصلہ" عبداللہ ادیب، پشاور۔ "رحمت کا فرشتہ" قرۃ العین شارق، کراچی۔ "قائد کا دیس" عابد انور، کراچی۔ "زندہ مثال" حفصہ صدیقی، کراچی۔ "ابصار کا کارنامہ" سید نوید احمد، کراچی۔ "ہمارا کارنامہ" عائشہ رشید، لاہور۔ "غفلت" سلمٰی ناز بلال، کراچی۔ "ایمانداری کی سزا" "نادان" امجد حسین (؟) "غریب لکڑ ہارے کی دعا" "گھنٹی کا بھوت" انیلا ارشد، ضلع سکھر۔ "موٹاپا اچھا نہیں" فہد آفتاب، کراچی۔ "قائداعظم اور سفارش" اطہر رفیق، کاموکے۔ "قائد کا مزار" بلال سرور، لاہور۔ "وطن کے پیارے بچو" ایم فاروق عاشق، لاہور۔ "چھکا" عابد انور، کراچی۔ "فیچ کس کے لئے" "وہ صفا پر حضور کا خطاب" حارث الرحمٰن، کوئٹہ۔ "سونے والے جاگو" سعدیہ محمد اسلم سومرو، جیکب آباد۔ "برے دوست" "ماسی چالاکوں شہر میں" ثمینہ نازلی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "میاں مسرا اور بی کھلو" عبدالرحمٰن، مظفر گڑھ۔ "امی سے شکایت" ناصر حفیظ (؟) "بارش کے بعد" افتخار حسین، راہوجا۔ "شرارت کا انجام" سیف اللہ، بھکر۔ "ماضی کے راز" ملک تبسم، جہلم۔ "خوش قسمت وزیر" ساجد علی عباسی، گجرات۔ "قاتل کون" "ناکام سازش" "تین شکاری" "عجیب مستقبل" منصور احمد مگسی، جیکب...

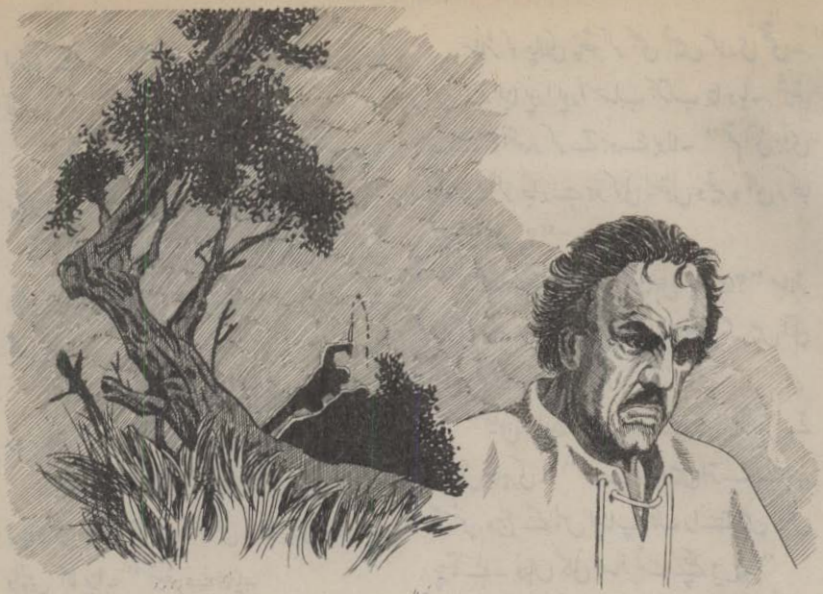

دامن کے ٹکڑے

حماد خالد فیاضی

گاڑی بڑی تیزی سے اپنی منزل کی جانب بڑھے چلے جارہی تھی۔ شام آہستہ آہستہ رات میں ڈوب رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سردی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

سلاٹر کو جب سردی لگی تو وہ مزید سکڑ گیا۔ وہ ایک غریب شخص تھا۔ مویشی پالنا اور انہیں فروخت کر دینا اس کا پیشہ تھا۔ اس مرتبہ مویشی فروخت کرنے سے اسے کچھ توقع سے زیادہ ہی نفع ہو گیا تھا۔ اب یہ منافع دس ہزار ڈالر کی صورت میں اس کے کوٹ کی خفیہ جیب میں موجود تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو.....؟" اس کے پاس بیٹھے شخص نے سکوت سے تنگ آکر پوچھ ہی لیا۔

سلاٹر بے ساختہ چونک پڑا۔ "کوئی خاص بات نہیں۔" اسے یہ مداخلت ناگوار گزری تھی۔

"میرا نام شیفر ہے....." وہ باقاعدہ تعارف پر اتر آیا اور پھر مجبوراً سلاٹر کو بھی اپنا تعارف کرانا پڑا۔

"کہاں سے آرہے ہو اور کہاں تک جانے کا

ارادہ ہے .....؟" شیفر کافی باتونی ثابت ہو رہا تھا۔

"پائن سٹی سے آ رہا ہوں اور آسٹین ویلج جاؤں گا۔" سلاٹر نے جواب دیا۔

"پائن سٹی سے تو میں بھی آ رہا ہوں لیکن میں بیکار ہی وہاں گیا۔" شیفر نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ بیکار کیوں؟" سلاٹر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں لینے تو مویشی گیا تھا مگر ان کی قیمت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ اس لئے خالی ہاتھ ہی واپس آنا پڑا۔" شیفر نے بتایا۔

"تمہیں ان کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" سلاٹر پھر بے قابو ہو گیا۔

"دراصل کریپ ٹری میں میں اکیلا ہی قصاب ہوں۔ کافی عرصے سے میری دکان بند پڑی ہے۔ کیونکہ گوشت مجھے مہنگا پڑتا ہے لیکن گاؤں والے مقررہ قیمت سے زیادہ پر گوشت ہی نہیں خریدتے۔" شیفر نے تفصیلاً بتایا۔

سلاٹر سیدھا سا آدمی تھا۔ کہنے لگا۔ "اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تمہارے گاؤں میں مویشیوں کی کمی ہے تو میں اپنے جانور یہیں فروخت کر دیتا۔ آگے جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔"

"اچھا تو تم پائن سٹی میں مویشی بیچ کے آ رہے ہو؟" پھر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"کتنے کے بیچے؟"

سلاٹر کو چالاکی چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اس نے اپنا پورا پورا حساب کتاب بتا دیا۔ شیفر خدشے کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "تم اتنی بڑی رقم لے کر جا رہے ہو کوئی پستول وغیرہ بھی رکھا ہے کہ نہیں؟"

"بھلا پستول کی ضرورت ہی کیا ہے؟" سلاٹر سادگی سے بولا۔ "کسی کو کیا معلوم کہ میں اتنی بڑی رقم لے کر جا رہا ہوں؟"

"لیکن راستہ خطرناک ہے۔" شیفر نے تشویش ظاہر کی۔ "کریپ ٹری میں اترنے کے بعد آسٹن ویلج کے بس اسٹاپ تک راستے میں جنگل پڑتا ہے۔ وہاں کافی مسافر لٹ چکے ہیں۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔" سلاٹر بولا۔ "میں کوشش کروں گا کہ رات ہونے سے پہلے بس اسٹاپ تک پہنچ جاؤں۔"

"مگر یہ گاڑی سات بجے تو کریپ ٹری پہنچے گی۔ پھر تم کس طرح رات سے پہلے بس اسٹاپ تک پہنچو گے؟" شیفر جرح کرتے ہوئے بولا۔

سلاٹر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"کیا تمہارا کوئی عزیز رشتہ دار کریپ ٹری میں نہیں رہتا جہاں تم رات گزار سکو؟"

"رہتا تو ہے۔" سلاٹر کہنے لگا۔ "لیکن مجھے اس کے گھر کا پتہ نہیں۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" شیفر نے پوچھا۔

"جارج کم....."

"کیا!! جارج کم ..... وہ تو میرا پڑوسی

ہے۔" شیفر بے اختیار بولا۔

"تو پھر تم مجھے اس کے گھر پہنچا دو گے؟" سلاٹر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں ..... کیوں نہیں۔"

سلاٹر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ لیکن شیفر کا ذہن تیزی سے منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔

کریپ ٹری کا اسٹیشن آنے ہی والا تھا۔ ان دونوں نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور گاڑی رکتے ہی اتر گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ قصبہ میں داخل ہو گئے۔ شیفر رات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہیں رستے میں ہی سلاٹر کا قصہ تمام کرنا چاہتا تھا۔ اسے صرف مناسب موقعہ کا انتظار تھا۔ چلتے چلتے وہ قصبے کے مرکزی بازار میں داخل ہو گئے جو اس وقت سنسان پڑا تھا۔ آخر شیفر نے قہوہ خانہ سے اگلی تاریک گلی کا انتخاب کیا۔

وہ قہوہ خانہ کے قریب سے گزرے تو ایک شخص باہر نکل رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر سلاٹر کو گھورا اور پھر حیرت سے بولا۔

"ارے سلاٹر تم ..... یہاں کیسے؟"

سلاٹر فوراً اس شخص سے لپٹ گیا۔ "یہ تم ہو جارج .....؟"

ادھر شیفر پیچ و تاب کھا رہا تھا کیونکہ سلاٹر کی موت چند لمحوں کے فاصلے سے ٹل گئی تھی۔

جارج کہہ رہا تھا۔ "چلو جلدی سے گھر چلیں۔ ممی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ اتنے عرصے بعد تم سے مل کر وہ یقیناً بہت خوش ہوں گی۔"

"ہاں ہاں۔ ابھی چلتے ہیں۔" سلاٹر بولا۔ "لیکن پہلے میں شیفر کا شکریہ تو ادا کر دوں۔" شیفر نے شکریہ کا روکھا سا جواب دیا۔ پھر کسی خیال کے تحت پوچھا۔ "سلاٹر! کل پھر تم صبح آسٹن ویلج چلے جاؤ گے یا نہیں؟"

"یقیناً۔" سلاٹر نے کہا "میں کل صبح پہلی بس ہی سے آسٹن ویلج روانہ ہو جاؤں گا۔" پھر وہ دونوں دوست باتیں کرتے چلے گئے۔

شیفر بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ ایک بہترین شکار اس کے ہاتھ میں آکر نکل گیا تھا۔ دس ہزار ڈالر کم نہیں ہوتے۔ وہ اس رقم سے اپنی بگڑتی ہوئی اقتصادی حالت سنبھال سکتا تھا۔ لیکن جارج نے عین وقت پر مداخلت کر کے اس کے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔

اچانک اس کے شاطر دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے راستہ بدلا اور گھر جانے کے بجائے ایک سنسان گلی میں مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ قصبے کے ایک غنڈے کے پاس بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے شیفر؟" خوفناک صورت والے غنڈے نے پوچھا۔ "کوئی خاص کام ہے کیا؟"

"ہاں ....." شیفر بولا۔ "ایک آدمی کو ٹھکانے لگانا ہے۔ اس کے پاس دس ہزار ڈالر ہوں گے۔ اس میں سے ایک ہزار تمہارے باقی میرے۔ بولو منظور ہے؟"

"منظور ....." وہ مسکرایا "اب یہ بتاؤ مجھے یہ کام کب اور کہاں کرنا ہے؟"

"کل صبح شکار کو آسٹن ولیج جانے والی پہلی بس پکڑنی ہے۔ جب وہ رستے میں پڑنے والے جنگل میں سے گزرے تو تم اپنا کام دکھا دینا۔"

"اس کی عمر... قد کاٹھ.... شکل و صورت؟"

"میرے ہی جتنا قد ہے۔ رہی شکل و صورت تو وہ تمہیں صبح کے اندھیرے میں نظر ہی نہیں آئے گی۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ جنگل میں سے گزرنے والا پہلا آدمی ہو گا۔"

"ٹھیک ہے ..... یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔"

شیفر اب گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈالر ہی ڈالر تھے۔ گھر پہنچ کر اس نے دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد اس کے بیٹے اسکاٹ نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ گھر میں سب سو چکے تھے۔ اسکاٹ بھی دروازہ بند کر کے سونے چلا گیا۔ شیفر بھی لیٹ گیا۔ اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ آخر رات کے کسی پل اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے ہوش اس وقت آیا جب اس کی بیوی نے اسے جھنجھوڑا۔

"شیفر اٹھو۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں لیکن اسکاٹ ابھی تک گھر نہیں آیا۔ وہ منہ اندھیرے لکڑیاں کاٹنے جنگل کی طرف گیا تھا۔"

"اچھا..... میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر شیفر اٹھ گیا۔ لیکن گھر سے نکلتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کیونکہ اس کی نظروں کے سامنے سلاٹر اور جارج کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ جلدی سے ان کی طرف بڑھا۔

"تم گئے نہیں سلاٹر!؟"

"نہیں۔" سلاٹر بولا "ممی نے مجھے بے حد اصرار کر کے ایک دن مزید ٹھہرنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

یہ سنتے ہی وہ جنگل کی طرف بھاگا۔ اس کا دماغ شدید طوفان کی زد میں تھا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ "اسکاٹ، اسکاٹ ..... بیٹے تم کہاں ہو؟" وہ چند قدم آگے بڑھتا اور پھر اپنے بیٹے کو آوازیں دینے لگتا۔ اس کی نظریں اسکاٹ کی تلاش میں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔

وہ کچھ آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک ایک درخت کی شاخیں ہلیں اور کوئی بھاری چیز اس کے عقب میں آ کر گری۔ شیفر نے سہم کر پیچھے دیکھا۔

"بس ڈر گئے ..... ۔" کسی نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ وہی غنڈہ تھا۔

شیفر اس سے اسکاٹ کے بارے میں پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بول پڑا۔

"یار شیفر تمہارا شکار جیسے ہی گزرا میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ لیکن اس کے پاس تو کچھ

بھی نہیں تھا جبکہ تم کہہ رہے تھے کہ اس کے پاس ۱۰ ہزار ڈالر ہوں گے۔

آؤ تمہیں بھی اس کی زیارت کروا دیں۔"

شیفر مشینی انداز میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد وہ ایک جھاڑی کے قریب رک گیا۔ اس نے جھاڑی کے اطراف میں جمی گھاس پھونس ایک جگہ سے ہٹادی۔

شیفر نے جھک کر لاش کی طرف دیکھا۔ پھر ..... ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ اور ..... اور اب وہاں دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک شیفر کی اور دوسری ..... اس کے بیٹے اسکاٹ کی۔

اپنے دوستوں کو آنکھ مچولی کا تحفہ دیجئے

آپ کے ایسے دوست جو آنکھ مچولی پڑھنا چاہتے ہوں لیکن اسے خریدنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، آپ انہیں آنکھ مچولی کا تحفہ مفت پیش کر سکتے ہیں آپ ان کا نام اور پتا نیچے دیے ہوئے کوپن میں لکھ کر ہمیں بھیج دیجئے۔ ادارہ ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی دس ساتھیوں کو اپنا ممبر بنالے گا اور انہیں ایک سال کے لئے آنکھ مچولی مفت جاری کر دیا جائے گا۔ اس طرح آپ ایک نیک کام کریں گے اور ادارہ آنکھ مچولی کو بھی ایک نیک کام کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔

کوپن برائے تحفہ آنکھ مچولی

میرے دوست کا نام: _____ کلاس: _____

گھر کا پتا: _____

کیا کچھ ملک غائب ہو جائیں گے

جمیل احمد

دوستو

اگر آپ کو ہم بتائیں کہ دنیا کے چند ممالک کچھ عرصہ بعد اچانک غائب ہو جائیں گے تو کیا آپ یقین کر لیں گے؟ نہیں کریں گے نا۔ اچھا فرض کیجئے کہ ہم سچ بول رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ دنیا کے کچھ ممالک واقعی آج سے کوئی تیس چالیس سال بعد شاید اچانک غائب ہو جائیں۔ ایسے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

مثلاً اگر آپ کراچی سے ہوائی جہاز میں بیٹھیں اور مالدیپ جانا چاہیں تو معلوم ہے کیا ہو گا؟ ہو گا یہ کہ آپ کا جہاز جب اس جگہ پہنچے گا جہاں مالدیپ واقع ہے تو وہاں بس سمندر ہو گا۔ آپ کھڑکی سے لاکھ جھانکتے رہئے لیکن آپ کو مالدیپ کے ننھے منے خوبصورت جزیرے نظر نہیں آئیں گے۔ نظر کیوں آئیں؟ وہ ہوں گے ہی نہیں۔ اچھا بتائیے ..... ایسا کیوں ہو گا؟

آپ کہیں گے شاید کوئی آتش فشاں پھٹ جائے گا۔ ہو سکتا ہے لیکن آتش فشاں پہاڑ سے ملک غائب تو نہیں ہوا کرتے۔ آپ کو ایٹم بم یاد آجائے گا۔ شاید ایسا ہو۔ لیکن پھر وہی بات کہ ملک تو ایٹم بم سے غائب نہیں ہو جائے گا نا۔

شاید آپ کو وہ سائنسی کہانیاں یاد آجائیں جن میں کوئی پراسرار مخلوق کسی اور سیارے سے حملہ کر کے زمین کو تباہ کر دیتی ہے۔ نہیں بھئی۔ یوں بھی نہیں ہے۔

چلئے ہم بتاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے دنیا میں کچھ پہاڑ ہیں۔ بہت اونچے اونچے۔ ایسے پہاڑ جن پر برف جمی رہتی ہے۔ ہمیشہ..... وہ کبھی پگھلی ہی نہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے ان پہاڑوں پر برف جمی ہوئی ہے۔ مسلسل۔

اچھا لیکن اب کیا ہو رہا ہے کہ وہ برف پگھلنے لگی ہے۔ اس لئے کہ اب ہر سال گرمی بڑھ رہی ہے۔ پوری دنیا میں۔ وہ کیوں؟ وہ آلودگی کی وجہ سے۔ آلودگی کا لفظ آپ سن تو چکے ہوں گے۔ آج ہم آپ کو آلودگی کا ایک نیا خطرہ بتا رہے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جب دنیا میں بہت زیادہ دھواں ہو جائے، بہت ساری گیسیں پیدا ہو جائیں جو قدرتی ماحول کے لئے نقصان دہ ہوں تو ان سے ماحول بگڑ جاتا ہے۔ جیسے اب گرمی بڑھ رہی ہے۔ خیر..... اب گرمی بڑھنے سے کیا ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی برف پگھلتی ہی چلی جاتی ہے۔ ابھی تو یہ برف زیادہ نہیں پگھلی لیکن اگر یونہی پگھلتی رہی تو ایک دن یہی ہو گا کہ سمندر میں پانی بڑھ جائے گا۔ اتنا کہ..... کہ اس کی سطح ذرا اونچی ہو جائے گی۔ سمندر اگر اونچا ہو جائے تو کیا ہو گا!

وہ اس پاس کے جزیرے پر چڑھ جائے گا۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ جزیرے غائب ہو جائیں گے۔

ایسا وہاں ہو گا، جو جزیرے سمندر سے زیادہ اونچے نہیں۔ ہمارا وطن تو سمندر سے بہت اونچا ہے لیکن مالدیپ زیادہ اونچا نہیں ہے۔

پھر ہو گا یہ کہ کسی دن اگر آپ مالدیپ جانے کے لئے ہوائی جہاز میں بیٹھیں گے تو سمندر ہی سمندر ہو گا۔ مالدیپ آپ کو نہیں ملے گا۔ وہ سمندر کی لہروں کے نیچے چلا گیا ہو گا۔

کتنی پریشانی کی بات ہے۔ اس لئے سائنس دان اس صورتحال پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں ہماری تو دعا ہے کہ ان کی کوشش کامیاب ہو جائے۔ آپ بھی دعا کیجئے۔ سنا ہے بچوں کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے۔

دستخط نہ لے سکا

قائداعظم کو بچوں سے بہت محبت تھی اور وہ ان کی معصوم خواہشات کا بہت خیال رکھتے تھے ایک بار جب وہ طلبہ سے خطاب کرنے کے لئے آئے تو ان سے آٹو گراف لینے والوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ ہر کوئی دستخطوں کے لئے قائداعظم کے سامنے خوبصورت آٹو گراف بک پیش کر رہا تھا۔ ایک لڑکا اس ہجوم میں ایسا بھی تھا جس کے پاس کوئی آٹو گراف بک نہ تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک سادہ کاغذ قائداعظم کے سامنے رکھ دیا۔ قائداعظم بچے کو دیکھ کر مسکرا دیئے اور یہ کہتے ہوئے کاغذ بچے کو تھما دیا۔ "بیٹے تم تو گاندھی سے بھی بڑے نکلے۔ وہ آج تک مجھ سے کسی سادہ کاغذ پر دستخط نہ لے سکا۔" مرسلہ: عدیم اختر میمن، میرپور خاص۔

وہ کیا راز تھا؟

محمد عمر احسان

قسط نمبر ۱۴

بھائی کی چیخ سنتے ہی کتاب جواد کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔ ٹرین میں اس کے ہم سفر شیر بہادر صاحب ایک پراسرار شخصیت ثابت ہوئے۔ انہوں نے کسی عجیب و غریب صلاحیت سے ٹکٹ کا نمبر تبدیل کر دیا..... اسلام آباد میں ٹھہرنے کے لئے انہوں نے جواد کو ہوٹل اسپا کا کارڈ دیا جو بعد میں "ہوٹل اسپائیڈر نکلا۔ وہاں آٹھ کا ہندسہ گردش کر رہا تھا اور مکڑیوں پر حیرت انگیز تجربات کئے جا رہے تھے۔

چھوٹی چھوٹی مکڑیاں سفید سفوف کھا کر بڑی بڑی بدہیت عفریتوں میں تبدیل ہو گئیں انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ہوٹل میں موجود لوگوں کو مار ڈالا لیکن لاشیں زندہ ہو گئیں۔ مر کر زندہ ہونے والوں نے آبِ حیات سے غسل کیا تو سب کے زخم بھر گئے۔

ٹرکوں سے چپٹی ناک والے عجیب و غریب بونے اتر رہے تھے۔ بونوں کی یہ عجیب و غریب نسل پوری دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی..... ہرے رنگ کا مشروب پیتے ہی جواد کو کچھ ہوش نہ رہا جب ہوش آیا تو وہ راولپنڈی اسٹیشن کی ایک بنچ پر پڑا تھا اور ہاتھوں میں تین تین انگلیوں کا اضافہ ہو چلا تھا اسے سپاٹ عمارتوں پر مکڑی کی طرح اترنے چڑھنے کی صلاحیت حاصل ہو گئی تھی لیکن سب سے حیرت انگیز صلاحیت ٹیلی پیتھی تھی ایک ایسا علم جو دنیا میں نایاب ہے۔ ایک پراسرار ہیٹ والا مسلسل جواد کا تعاقب کر رہا تھا اور جب جواد نے آگ میں گھری ہوئی عمارت سے بچے کو بچایا تو اس ہیٹ والے نے

طاقتور کیمرے سے جواد کی کئی تصاویر کھینچ لیں راولپنڈی کا گجر بدمعاش اس کے ساتھی اور ایک کوچ کا کنڈیکٹر جواد کی ٹیلی پیتھی کا نشانہ بنے..... جس بچے کو جواد نے آگ میں جلنے سے بچایا تھا وہ اسے فرشتہ سمجھ رہا تھا۔ جواد بچے کی معصومیت اور ذہانت سے متاثر ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ وہاں اس نے بچے کے سامنے ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ کیا اور بتایا کہ بچے کی والدہ اس وقت کہاں ہیں؟..... ہوٹل اسپائیڈر اور خود اپنے جسم میں ہونے والی حیرت انگیز تبدیلیوں پر سے پردہ اٹھانے کے لئے جب جواد نے شیر بہادر صاحب کے دماغ میں پہنچنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ شیر بہادر صاحب کا دماغ خاموش ہو چکا ہے.....!!

اب آپ آگے پڑھئے

اسی وقت ایک کوچ اس کے قریب آ کر رُکی۔ کنڈیکٹر شکر پڑیاں کی آواز لگا رہا تھا۔ "مجھے ایک بار پھر وہاں جا کر ہوٹل اسپائیڈر کو تلاش کرنا ہوگا۔" یہ سوچ ذہن میں پیدا ہوتے ہی جواد کوچ میں سوار ہو گیا۔ کوچ کے چلتے ہی آئس کریم کی دکان کے سامنے کھڑی سفید کار بھی حرکت میں آ گئی۔ اب وہ اس کوچ کے پیچھے جا رہی تھی۔

جواد کو سیٹ مل گئی تھی۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گردن سیٹ سے ٹِکا دی۔ وہ خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا..... ٹیلی پیتھی اس کے پاس تھی۔ وہ جس کو چاہتا ٹیلی پیتھی کا نشانہ بنا دیتا۔ بڑے بڑے بدمعاش اس صلاحیت کے آگے بے بس ہو گئے تھے۔ اس کی سوچ کی لہریں پلک جھپکتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتی تھیں لیکن بے بسی کی بات یہ تھی کہ وہ جن کے دماغوں میں جھانکنا چاہتا تھا وہ اس کی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی اپنی سانسیں روک لیتے تھے دوسرے لفظوں میں وہ "یوگا" کے ماہر تھے۔ یوگا وہ علم ہے جس میں پہلے سانس لینے اور سانس روکنے کی ورزشیں کرائی جاتی ہیں اور پھر دوسری مشقوں تک پہنچا جاتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ہوٹل اسپائیڈر والے کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں..... ؟ "کیا وہ مجھے بطور چارہ استعمال کرنا چاہتے ہیں؟..... " جواد نے سوچا۔ آٹھ کا ہندسہ ..... سفید سفوف کھا کر بڑی ہو جانے والی مکڑیاں خونی مکڑیوں کی مار کاٹ ..... آبِ حیات کے پانی سے غسل ..... ٹرکوں سے اترنے والے عجیب غریب بونے پھر شیر بہادر صاحب کے دماغ سے سوچ کی لہروں کا واپس آ جانا یہ ساری باتیں جواد کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ کوئی ایسا سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا جس کی مدد سے وہ اصل حقیقت تک ہوٹل پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ ہاتھوں پر چڑھے دستانے آنکھوں پر لگا کالا چشمہ ان چیزوں سے اب اسے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ "میرے خیال میں محکمہ اطلاعات کے دفتر جایا جائے اور وہاں سے معلوم کیا جائے کہ شیر بہادر صاحب ..... !!" جواد کی سوچ کی لہریں بکھر گئیں۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ "گاڑی سائیڈ میں لگا لو..... " سامنے سے جلوس آ رہا ہے۔ کنڈیکٹر نے ڈرائیور سے کہا اور ڈرائیور نے

"کیسا جلوس؟" کسی نے پوچھا۔ لوگ اپنی سیٹوں سے اٹھ اٹھ کر جلوس کو دیکھنے لگے۔

"مہنگائی کے خلاف مظاہرہ ہو رہا ہے..... یہ جلوس ایوان صدر پر مظاہرہ کرے گا۔" کسی نے بتایا۔ جواد نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے دائیں طرف کچھ دور ایوان صدر کی عمارت نظر آ رہی تھی جس پر قومی پرچم لہرا رہا تھا..... پھر جواد نے جلوس کے شرکا کی طرف نظر دوڑائی..... سینکڑوں کی تعداد میں لوگ تھے جنہوں نے ہاتھوں میں بینر اور کتبے اٹھا رکھے تھے جن پر مہنگائی اور حکومت کی پالیسیوں کے خلاف نعرے درج تھے۔ لوگ زور زور سے نعرے بھی لگا رہے تھے..... "مہنگائی کے ایوانوں میں آگ لگا دو آگ لگا دو....." کسی بدمزگی سے نپٹنے کے پیش نظر ایوان صدر کے علاقے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

"لگتا ہے آج ہنگامہ ہو گا۔" جواد کے بائیں طرف سیٹ پر بیٹھے ہوئے بڑے صاحب نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔ اس نے گردن ہلائی پھر بولا۔ "ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔ سنا ہے آج ایوان صدر میں وزیر اعظم اور صدر بھی کسی اہم مسئلے پر ملاقات کر رہے ہیں۔"

"وہ اہم مسئلہ تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی ہو گا؟ حکومت یقیناً اسی پر سوچے گی!!"

"ارے صاحب..... مہنگائی..... اور وہ بھی مسئلہ ان حکومتوں کو صرف اپنی کرسیوں سے اور ہمدرد نہیں اگر یہ ہمدرد ہوتیں تو آج ہمارے ملک کی عوام ننگی اور بھوکی نہ ہوتی۔"

کوچ میں موجود لوگ حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔ جواد کچھ دیر تک تو لوگوں کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے گردن دوبارہ اس طرف گھمائی جس طرف ایوان صدر کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ جواد نے ریڈیو اور ٹی وی پر صدر کی اکثر تقریریں سنی تھیں ان کے لب و لہجے کو پکڑ کر وہ ان کے دماغ میں پہنچ گیا۔ صدر صاحب اس وقت ایک گول میز کے سامنے بیٹھے اپنے صاف و شفاف سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ان کے سامنے دوسری کرسی وزیر اعظم کی تھی۔ جواد صدر کے دماغ میں رہ کر وزیر اعظم کے ساتھ ہونے والی بات چیت سننے لگا۔ صدر صاحب کہہ رہے تھے۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا اس ملک کا کیا بنے گا ہر روز ہڑتال ہر روز مظاہرے..... عوام اس طرح نہیں سدھریں گے۔"

وزیر اعظم نے ان کی بات کے جواب میں کہا۔ "اس ملک کے عوام اصل میں لاتوں کے بھوت ہے اس کے سر پر جب تک ڈنڈا نہ مارا جائے یہ چین سے نہیں بیٹھتی ہے۔" جواد نے صدر کے دماغ کو کریدا تو پتا چلا کچھ دیر بعد کاروباری امور سے متعلق کوئی اہم میٹنگ ہونے والی ہے جس میں بیرونِ ملک سے چند غیر ملکی سرمایہ دار شرکت کر رہے ہیں جو اپنی پسندیدہ شرائط پر ملک میں سرمایہ کاری کرنے

کے خواہشمند ہیں۔

ایک ماتحت نے آکر بتایا "میٹنگ تیار ہے"، تو صدر اور وزیراعظم میٹنگ روم میں آگئے جہاں تین غیر ملکی سرمایہ دار بیٹھے تھے۔ صدر اور وزیراعظم کو دیکھتے ہی تینوں کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔

"آپ لوگ تشریف رکھیں۔" وزیراعظم نے کہا۔

"ہاں بھئی ایجنڈا کہاں ہے میں اسے ذرا ایک نظر دیکھ تو لوں۔" ایجنڈا صدر صاحب کے سامنے رکھ دیا گیا اور میٹنگ شروع ہو گئی۔ "آپ لوگوں کی شرائط تو خاصی مشکل ہیں ہم آپ کو سرمایہ کاری کے لئے اپنی ساحلی علاقے تو اس طرح نہیں دے سکتے۔"

صدر صاحب نے عادت کے مطابق سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آپ یہ سب چھوڑیں پہلے یہ بتائیے کہ آپ ان ساحلی علاقوں پر کس قسم کی سرمایہ کاری کریں گے؟" ایک سرمایہ دار نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"ہم اس ملک کی قسمت چمکا دیں گے۔" دوسرے نے کہا۔ "ہم اس ملک میں ڈالروں کا سیلاب لائیں گے کوئی شخص بھی غریب نہیں رہے گا۔"

اب جواد نے وزیراعظم کے دماغ پر قبضہ جمایا۔ وزیراعظم نے کہا۔ "یہ سبز باغات آپ فی الحال ہمیں نہ دکھائیں یہ بتائیں کہ آپ ہمارے ملک میں کس قسم کی صنعتیں لگائیں گے۔"

"ہم یہاں ساحلی علاقوں سے تیل اور پٹرول نکالیں گے اور ہم یہاں ....."

"تیل اور پٹرول تو بعد میں نکالئے گا۔" وزیراعظم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پہلے ایک کارخانہ لگائیے گا تیل بنانے کا..... میرا مطلب ہے سر کے تیل کا کیوں کہ مجھے صدر صاحب کی بہت فکر ہے یہ دن بدن "فارغ البال" ہوتے جا رہے ہیں ..... میرا مطلب ہے .....!!" وزیراعظم نے صدر صاحب کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

وزیراعظم کی یہ حرکت دیکھ کر غیر ملکی سرمایہ دار اور خود صدر صاحب بھونچکے رہ گئے۔ اسی وقت جواد نے وزیراعظم کے دماغ کو آزاد کر دیا اور خود صدر صاحب کے دماغ میں پہنچ گیا۔ صدر صاحب کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور چیخ کر بولے۔

"میں بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں اس طرح تو کسی کا مذاق نہیں اُڑانا چاہئے۔" اتنا کہہ کر انہوں نے غیر ملکی سرمایہ داروں کی طرف دیکھا اور غصے سے بولے۔ میں آپ لوگوں کو پاک سرزمین سے ایک چُلّو تیل بھی حاصل نہیں کرنے دوں گا۔ اس ملک میں ہمارے ہی سرمایہ دار سرمایہ کاری کریں گے۔ آپ ہمارے ملک کی معیشت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں ..... نکل جائیے اسی وقت یہاں سے ورنہ مار مار کر آپ سب کو "فارغ البال" کر دوں

گا۔ "

اس جملے کے ساتھ ہی جواد صدر کے دماغ سے نکل کر وزیر اعظم کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وزیر اعظم نے چیخ کر کہا۔ "آپ کس کس کو فارغ البال کریں گے!!" اب جواد ایک سرمایہ دار کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس سرمایہ دار نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا بگاڑ لیں گے آپ ہمارا کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے خدا گنجوں کو ناخن نہیں دیتا ہے۔"

میٹنگ روم میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ ایک ہنگامہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت آنسو گیس کا شیل گاڑی میں آ کر پھٹا اور بدبو دار دھواں چاروں طرف پھیل گیا۔ جواد کو صدر وزیر اعظم کو چھوڑ کر عوام میں واپس آنا پڑا کیوں کہ اب ایوان صدر کے باہر بھی ہنگامہ شروع ہو گیا تھا لوگ پولیس پر پتھر مار رہے تھے اور پولیس والے لوگوں پر لاٹھیاں برسا رہے تھے، آنسو گیس کے شیل چھوڑ رہے تھے۔ لوگوں کے آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا وہ گھبراہٹ کے عالم میں ایک دوسرے پر گرتے پڑتے چیختے چلاتے گاڑی سے اترنے لگے تھے۔ گاڑی کے باہر بھی چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔

جواد نے ہمت کر کے جلتا ہوا شیل اپنے دستانے والے ہاتھ سے اٹھایا اور پولیس کے سپاہیوں پر پھینک دیا۔ عورتیں اور بچے بری طرح رو رہے تھے۔ جواد اور چند نوجوانوں نے انہیں ہنگامے کی جگہ سے دور ہونے میں مدد دی۔ لوگ ابھی تک کھانس رہے تھے اور آنکھوں اور سینے میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی کیوں کہ آنسو گیس کا دھواں اب چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقامات تک منتقل کرنے کے بعد ..... جواد بھاگتا ہوا ہنگامے کی جگہ سے دور جانے لگا اور لوگ بھی محفوظ مقامات کی طرف بھاگ رہے تھے ایک عجیب افراتفری اور قیامت کا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے جواد ایک دوسرے روڈ پر نکل آیا پھر ایک گاڑی قریب آئی تو اس میں چڑھ گیا۔ گاڑی ایک عمارت کے قریب سے گزرنے لگی تو جواد چونک اٹھا وہاں محکمہ اطلاعات کا بڑا سا بورڈ لٹک رہا تھا۔

جواد نے گاڑی رکوائی اور نیچے اتر آیا۔ دفتری اوقات ختم ہو چکے تھے دفتروں میں کام کرنے والے لوگ دفتروں سے باہر نکل رہے تھے۔

جواد سیڑھیاں پھلانگتا ہوا ایک راہداری میں پہنچا جس کے دائیں طرف مختلف کمرے نظر آ رہے تھے پھر ایک کمرے کے باہر سپرنٹنڈنٹ کی تختی لگی دیکھ کر وہ سیدھا کمرے میں گھستا چلا گیا۔ اندر کمرے میں صدر صاحب کی طرح کے کوئی صاحب گھومنے والی کرسی پر براجمان کسی فائل کے مطالعے میں غرق تھے۔ جواد کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی ..... انہوں نے گردن اٹھا کر ایک نظر جواد کی طرف دیکھا پھر بولے۔ "آپ کل آیئے گا دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔!! اتنا کہہ کر وہ دوبارہ فائل کے مطالعے میں ڈوب گئے۔

"جناب! میں دفتری کام سے نہیں بلکہ شیر بہادر صاحب سے ملنے آیا ہوں۔" شیر بہادر صاحب سے!" ان صاحب نے چونک گردن سیدھی کی پھر جواد سے کہا۔

"آپ ہوش میں تو ہیں۔"

"کیا مطلب؟" جواد نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ صاحب بولے۔ "مطلب یہ کہ آپ نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔ شیر بہادر صاحب کو تو مرے ہوئے بھی پورے پانچ سال بیت چکے ہیں۔"

"پانچ سال..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ابھی دو دن پہلے ہی تو وہ ٹرین میں میرے ہم سفر تھے۔ انہوں نے کراچی سے اسلام آباد تک میرے ساتھ سفر کیا ہے۔"

اسی وقت ایک اور صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ "کیا ہوا بھئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"اکرام صاحب! یہ صاحب بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔" انہیں دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ صاحب بولے۔

"کیسی باتیں؟" اکرم صاحب نے پوچھا۔

"کہہ رہے ہیں کہ شیر بہادر صاحب انہیں دو دن پہلے ٹرین کے سفر میں ملے تھے اور یہ کہ وہ زندہ ہیں؟"

"زندہ ہیں!" اکرم صاحب کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

"صاحبزادے! لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ بھئی میں نے اپنے ان گناہ گار ہاتھوں سے ان کے کاندھے کو جنازہ دیا ہے، سپرد خاک کیا ہے۔"

یہ بات بڑی حیران کر دینے والی تھی۔ جواد مزید الجھن کا شکار ہو گیا اب وہ وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا اس لئے سپرنٹنڈنٹ اور اکرم صاحب سے کہا۔

الحدیث

- عالم کی موت عالم کی موت ہے۔
- لباس کی سادگی ایمان کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔
- اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا سب سے اچھا عمل ہے۔
- بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔
- آدمی کو اس کی نیت کے مطابق ہی اس کے عمل کا پھل ملتا ہے۔
- اچھی اور میٹھی بات بھی ایک صدقہ ہے۔
- دعا عبادت کا خلاصہ ہے
- دنیا میں اس طرح رہو گویا تم کوئی پردیسی یا مسافر ہو۔
- غنو و درگزر تقویٰ سے قریب تر ہے۔
- اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب اور قیامت کے دن مجھ سے زیادہ قریب وہ ہوگا جو تم میں سے سب سے بہتر اخلاق کا حامل ہوگا۔

مرسلہ: شائستہ شفیق الرحمٰن، حیدر آباد۔

تفریق

حساب کا یہ قاعدہ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔
تفریق کا ایک مطلب ہے، منہا کرنا
یعنی نکالنا ایک عدد میں سے دوسرے عدد کو۔
بعض عدد از خود نکل جاتے ہیں۔
بعضوں کو زبردستی نکالنا پڑتا ہے۔
ڈنڈے مار کر نکالنا پڑتا ہے
فتوے دے کر نکالنا پڑتا ہے
ایک بات یاد رکھئے
جو لوگ زیادہ جمع کر لیتے ہیں
وہی زیادہ تفریق بھی کرتے ہیں
انسانوں اور انسانوں میں
مسلمانوں اور مسلمانوں میں
عام لوگ تفریق کے قاعدے کو پسند نہیں کرتے
کیونکہ حاصل تفریق کچھ نہیں آتا
آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے

(اردو کی آخری کتاب، از ابن انشاء سے انتخاب)

مرسلہ: سہیلا ارم، واہ کینٹ۔

"آپ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں میری ہی طبیعت شائد کچھ خراب ہے۔" اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

محکمہ اطلاعات کے دفتر کے باہر روڈ پر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں اور ان گاڑیوں سے کہیں زیادہ جواد کا ذہن اس نے باہر آ کر سپرنٹنڈنٹ اور اکرم صاحب دونوں کے دماغوں میں پہنچ کر دیکھا۔

دونوں اپنی جگہ صحیح تھے۔ واقعی پانچ سال پہلے شیر بہادر صاحب مر چکے تھے۔

"کیا ہوٹل اسپائیڈر کا راز..... راز رہے گا اور میری یہی حالت رہے گی۔" جواد سوچتا رہا اور چلتا رہا۔ پیدل چلتے چلتے اس کے سامنے ایک ہوٹل آ گیا۔

"کیوں نہ ایک کپ چائے کا پی لیا جائے سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"

جواد ہوٹل میں پہنچ گیا اور چائے کا آرڈر دے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف محسوس کئے جا سکتے تھے۔

جواد کے ہوٹل میں گھستے ہوئے سفید کار بھی وہاں پہنچ گئی۔ پراسرار ہیٹ والا کار سے اتر کر ہوٹل میں پہنچ گیا جب کہ دونوں گنجے کار میں بیٹھے رہے۔

ہوٹل میں داخل ہو کر ہیٹ والے نے سرسری نظروں سے اس طرف نگاہ دوڑائی جدھر جواد بیٹھا تھا اور کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس نے کونے کی میز منتخب کی..... یہاں سے وہ جواد پر با آسانی نظر رکھ سکتا تھا پھر اس نے جیب سے اخبار نکالا اور سامنے پھیلا کر بظاہر اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔

"ہاں صاحب! چائے چلے گی۔" بیرے نے پوچھا۔

"ہاں ایک کپ گرما گرم چائے لے آؤ اور ہاں ساتھ میں کچھ نمکین بھی لیتے آنا۔"

"اچھا صاحب! ابھی لایا۔"

"نمکین" کی آواز جواد کے کانوں میں بھی پڑی۔ اس کا دل بھی ہوا کہ کچھ نمکین کھایا جائے۔ ہوٹل میں گرم گرم سموسے بھی تلے جارہے تھے۔ جواد نے گردن گھما کر بیرے کی طرف دیکھا وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جواد سموسوں کا آرڈر دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر دیکھے کرسی پیچھے کھسکائی پھر جیسے ہی مڑا کسی سے ٹکرا گیا۔

"سوری!" جواد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کک ..... کک ..... کوئی بات نہیں۔"

جواد نے دیکھا اس شخص کا چہرہ اچانک فق ہو گیا تھا جیسے اچانک اس کی کوئی چوری پکڑ لی گئی ہو۔

جواد سموسوں کا آرڈر دے کر دوبارہ اپنی میز کے قریب آ بیٹھا۔

"یہ شخص میرے اچانک اس طرح ٹکرانے سے گھبرا کیوں گیا تھا۔" جواد نے اس شخص کا سرسری سا جائزہ لیا پھر پلک جھپکتے میں اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ شخص سوچ رہا تھا۔ "اس کم بخت نے تو مجھے ڈرا ہی دیا میں تو سمجھا کہ بس اب راز کھل ہی گیا ہے" یہ بات خاصی حیران کن تھی۔ جواد نے اس کے دماغ کو کریدا تو معلوم ہوا ہوٹل اسپائیڈر کے منیجر نے اسے جواد کی نگرانی کے لئے بھیجا ہے اور یہ کہ صرف وہی نہیں اور لوگ بھی جواد کی نگرانی پر مامور کئے گئے ہیں ——— یہ بھی پتا چلا اس شخص کا نام شاہانی ہے۔ وہ پڑوسی ملک کا باشندہ ہے اور سراغرسانی کا ماہر ہے۔ وہ "اسپائیڈر" نامی گروہ کے لئے کام کر رہا ہے۔ یہ بین الاقوامی گروہ پوری دنیا پر حکمرانی کرنے کے لئے نت نئے تجربات میں مصروف ہے۔ اس کا مرکزی دفتر نیویارک میں ہے جب کہ ذیلی شاخیں تمام ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس گروہ میں دنیا بھر کے ذہین دماغ شامل ہیں۔ جن لوگوں کو یہ گروہ اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا ہے وہ لوگ اچانک مصنوعی موت مر جاتے ہیں۔ ان کے ورثا انہیں دفنا دیتے ہیں تو اسپائیڈر گروہ کے آدمی انہیں قبروں سے حاصل کر لیتے ہیں پھر آب حیات نامی مشروب پلا کر انہیں زندہ کر دیتے ہیں۔ یہ مشروب ان کے ماہر سائنس دانوں نے بڑی ریسرچ کے بعد بنایا ہے اور اس مشروب کے پینے سے ابدی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔

جواد کو یہ بھی پتا چلا کہ اسپائیڈر نامی گروہ نے دیوار قید سے ایک ہزار کی تعداد میں بونے آزاد کرائے تھے۔ یہ بونے بھی انہیں کی طرح پوری دنیا پر حکومت کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان بونوں کو بھی تجربات میں استعمال کیا جارہا ہے۔ انہوں نے سائنسی تجربات کے ذریعے انہیں میں سے آٹھ ہاتھ پیروں والا بونا بنایا ہے جو تمام بونوں کا باس ہے۔

شیر بہادر صاحب کے متعلق پتا چلا کہ کل آب پارہ کے قریب ان کا ایک تیز رفتار ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ٹرک نے انہیں تقریباً کچل دیا تھا لیکن چوں کہ انہوں نے آب حیات پی رکھا تھا

س لئے موت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی ان کے دماغ کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ انہیں ایک سبزی والے کا دماغ لگا دیا گیا ہے اس وقت وہ اسپائیڈر ہاسپٹل کے نہائی نگہداشت کے شعبے میں زیر علاج ہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ پانچ سال پہلے شیر بہادر صاحب مصنوعی طور پر مار دیئے گئے تھے پھر بعد میں انہیں قبر سے حاصل کر لیا گیا۔ وہ محکمہ اطلاعات کے دفتر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے اور ہپناٹزم کے ماہر تھے۔ ان کے علم کو اسپائیڈر گروہ اب اپنے لئے استعمال کر رہا تھا۔

مسٹر شاہانی کی کھوپڑی سے بڑے حیرت انگیز انکشافات ہو رہے تھے اور انکشاف کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا جواد اس کے دماغ میں رہ کر مزید معلومات کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دو فائر ہوئے اور ہوٹل میں موجود لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ دو نوجوان بڑی تیزی سے ہوٹل میں داخل ہوئے ان کے منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا اور انہوں نے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں اٹھا رکھی تھیں!!!

(جاری ہے)

اس حیرت انگیز اور دلچسپ کہانی کے مزید سنسنی خیز واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں!!

آنکھ مچولی کا تحفہ

آنکھ مچولی نے آپ کے دوستوں کو تحفہ دینے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس کی دوسری قرعہ اندازی میں مندرجہ ذیل خوش نصیب ساتھیوں کے نام نکلے ہیں:

(۱) عشرت بانو ریاض احمد، کراچی (۲) احسن افتخار، اٹک (۳) ذاکر بن نصیر، لاہور
(۴) مسلمہ شعیر خان، کراچی (۵) سیدہ شاہین زہرا، فیصل آباد (۶) اشرف علی، صوابی
(۷) شاہد خان، نواب شاہ (۸) علی عمران ساوند، کندھ کوٹ (۹) اویس ملک، کراچی
(۱۰) عبدالستار عرب ہبلو، کراچی۔

ادارہ ان ساتھیوں کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔ آنکھ مچولی اگلے ماہ سے انہیں جاری کیا جا رہا ہے۔ امید ہے نیکی کے اس کام میں آپ یونہی ہم سے تعاون جاری رکھیں گے۔

قلم دوست

ان کی تحریریں جو ادیب بننا چاہتے ہیں

روشنی

سیّد احمد شہیدؒ دہلی جا رہے تھے۔ راستے میں آپ نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو وزن اٹھائے جا رہا تھا اور اس کے ساتھ سپاہی بھی جا رہا تھا۔ بوڑھا بہت کمزور تھا مگر مجبوراً چل رہا تھا۔ پہلے آپ یہ سمجھے کہ سپاہی نے بوڑھے کو بے کار میں پکڑ لیا ہے مگر جب آپ نے سپاہی سے پوچھا تو سپاہی نے کہا "میں نے اس سے مزدوری طے کی ہے۔" بھوکے نے بھی اقرار کیا کہ میں نے بھوک سے بچنے کے لئے مزدوری طے کی ہے۔ آپؒ نے اسی وقت مزدوری کے پیسے اس سپاہی سے بوڑھے کو دلوائے اور سامان خود اُٹھا کر جہاں سپاہی کو جانا تھا وہاں تک اس کے ساتھ گئے۔

مرسلہ ...... محمد عمر قریشی، اسلام آباد

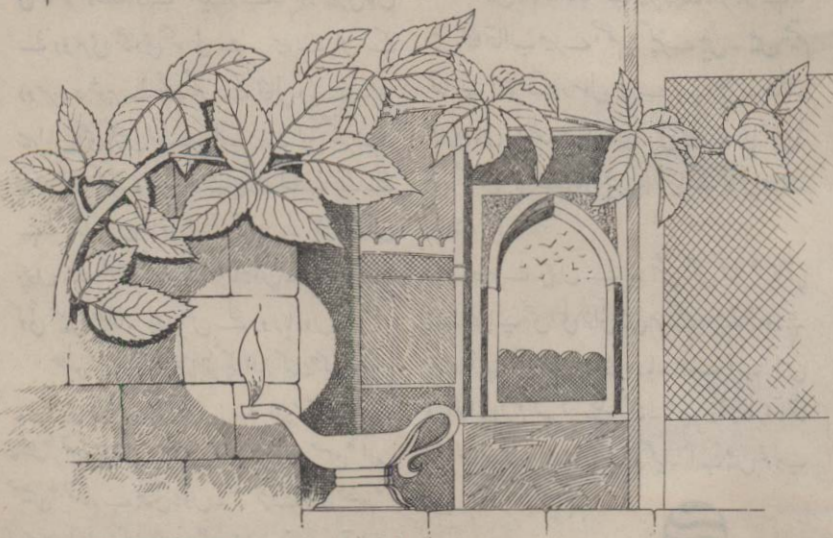

اُس عید پر کیا ہوا

عابد حسین چانڈیو، لاڑکانہ۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عید کی نماز کے لئے جا رہے تھے کہ راستے میں دیکھا کہ کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ ان میں ایک بچہ الگ بیٹھا رو رہا تھا۔ لباس بھی پھٹا ہوا تھا۔ آپؐ اس بچے کے پاس گئے اور شفقت سے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا "کیا بات ہے؟ کیوں رو رہے ہو۔ اور ان بچوں سے کیوں نہیں کھیلتے؟"

بچے نے حضورؐ کو نہیں پہچانا اور کہنے لگا "میرے باپ جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اور میری ماں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میرے ماں کے دوسرے شوہر نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اور میرا مال بھی چھین لیا ہے۔ اب میرا نہ کوئی گھر ہے، نہ میرے کپڑے ہیں اور نہ ہی کچھ کھانے کے لئے ہے۔ سارا دن مزدوری کرتا ہوں۔ شام کو ان بچوں سے کھیلنے کے لئے آتا ہوں۔ مگر مجھ سے کوئی نہیں کھیلتا۔ پس اس لئے رو رہا ہوں۔"

حضورؐ نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔"کیا تم اس بات سے خوش نہ ہو گے کہ رسول اللہؐ تمہارے باپ، عائشہؓ تمہاری ماں، علیؓ تمہارا چچا اور حسنؓ اور حسینؓ تمہارے بھائی ہوں۔" لڑکے نے حضورؐ کو پہچان لیا اور کہنے لگا۔ "میرا باپ آپ پر قربان ہوا اور میں بھی آپ پہ قربان ہوں۔ میں کیسے خوش نہ ہوں گا۔"

اس کے بعد آپؐ اس یتیم بچے کو گھر لے گئے۔ اسے صاف ستھرا کیا۔ صاف کپڑے پہنائے اور کھلایا۔ بچہ اب بہت خوش تھا۔ وہ ہنستا کھیلتا ان بچوں کے پاس آیا۔ بچوں نے ان سے پوچھا۔" کچھ وقت پہلے تو تم رو رہے تھے اور اب اتنا خوش ہو۔"

لڑکے نے جواب دیا۔

"میں بھوکا تھا۔ اب میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ میں ننگا تھا اب میرے جسم پہ کپڑے ہیں۔ میں یتیم تھا اب اللہ کے رسول میرے باپ ہیں۔ عائشہ میری ماں، فاطمہ میری بہن، علی میرے چچا حسنؓ اور حسینؓ میرے بھائی ہیں۔ تو کیا مجھے خوش ہونا نہ چاہئے؟"

دوسرے بچوں نے یہ سُن کر کہا "کاش ہمارے باپ بھی اسی لڑائی میں مر گئے ہوتے۔" وہ بچہ ہمیشہ آپؐ کی خدمت میں رہا۔ جب آپؐ اس دنیا کو الوداع کہہ کر چلے گئے۔ تب وہ لڑکا روتا تھا اور کہتا تھا کہ آج میں یتیم ہو گیا۔ اب میں غریب اور بے گھر ہو گیا!!

ماں کا خواب

شاعر۔ علامہ اقبال

انتخاب:۔ ایم اعجاز ادیب

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال!
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی!
زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے
وہ چُپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں
جُدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی!
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب
رُلائی ہے تجھ کو جُدائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چُپ رہا

بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
قدم کا تھا دہشت سے اُٹھنا محال
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں
مجھے اس جماعت میں آیا نظر
دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
مجھے چھوڑ کر آگئے تم کہاں
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا!

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

آزادی

اننت ناگ کے ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک گھر میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاید یہ اپنے لائحہ عمل پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد کل چھ کے قریب ہے۔ ان میں سے چار کے چہروں جسموں سے جوانی، مضبوطی، جوش اور عزم جھلک رہا ہے۔ جب کہ ایک بوڑھا بھی ان کی باتوں میں شریک ہے اور ایک گیارہ سالہ بچہ بھی ان کی باتیں بڑے انہماک سُن رہا ہے۔ اچانک کمرے میں آواز گونجتی ہے۔

"آج بھی چار حریت پسند مارے گئے۔ ہم کو فوراً اپنے ٹھکانوں سمیت حکمت عملی میں ردّو بدل کر لینا چاہئے۔" بوڑھا جو کافی دیر سے کسی انجانی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک آگئی۔ وہ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد بولا "میرا بھی یہی خیال ہے ہمیں جلد از جلد اپنے ٹھکانے تبدیل کر لینے چاہئے۔ لیکن میرے بچّو! تم کب تک یوں ہی اپنے ٹھکانے تبدیل کرتے رہو گے؟ ہمیں فوراً اس فوجی اڈے کو اُڑا دینا چاہئے جو دشمنوں کا مرکز ہے۔"

"لیکن بزرگو ! اسے اُڑانا بڑا مشکل کام ہے۔ وہاں زبردست قسم کا پہرہ لگا ہے اتنا زبردست کے چڑیا کا بچہ بھی وہاں پر نہیں مار

سکتا۔"

مجاہدین نے اپنے ٹھکانے بدل لئے اور انہوں نے کئی بار بھارتی فوجی مرکز کو اُڑانے کی ناکام کوشش بھی کیں پھر تھک ہار کر اپنا منصوبہ بدل دیا۔

ایک دن مجاہدین فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو فضا زور دار دھماکوں سے لرز اُٹھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک مجاہد نے آکر بتایا کہ بھارتی فوجی مرکز اُڑا دیا گیا ہے۔ یہ خبر سن کر تمام مجاہدین کے چہرے خوشی و مسرت سے تمتما اُٹھے۔

"لیکن یہ کارنامہ کس نے سر انجام دیا ہے؟" کیمپ کمانڈر نے پوچھا۔

"ایک گیارہ سالہ بچے مالک نے۔"

"مالک کہاں ہے؟" کیمپ میں کئی سوالات گونجے۔

"مالک!" "خبر لانے والا مجاہد زمین پر بیٹھ گیا شائد اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا جب وہ بولا تو رو رہا تھا۔

"مالک! نے ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لی ہے۔ میں نے خود اس کے جسم پر بم باندھے تھے اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ بم باندھ کر وہ بزدل بھارتیوں کے مرکز سے جا ٹکرایا اور ..... اور ..... اتنا کہہ کر مجاہد رو پڑا۔

جس قوم میں مالک جیسے شیر دل بچے موجود ہوں ان سے ان کی آزادی کوئی نہیں چھین سکتا.....!!

شمع انعام

لگتے ہیں وہ سب کو اچھے

پڑھنے لکھنے والے بچے
سب کو لگتے ہیں وہ اچھے
روز سویرے مکتب جائیں
"سر" کو فر فر سبق سنائیں
کرتے ہیں وہ سب کی خدمت
پائیں گے وہ اک دن جنت
سب دیتے ہیں انہیں دُعائیں
لیتے ہیں ہر روز بلائیں
پڑھنے لکھنے والے بچے
دھن کے پکے، قول کے سچے

عید کے دِن

صائمہ وفا

عید کا دن ہے خوشیوں والا
عیدی والا تحفوں والا
عید کے دن بس مزے اُٹھاؤ
خوشی مناؤ ناچو گاؤ
لیکن ان کو بھول نہ جانا
چھن گیا ہے جن سے عید منانا
ان کا دُکھ محسوس کرو تم
خود ہی میں مت مگن رہو تم
خوشیاں انہیں جو مِل جائیں گی
عید کی کلیاں کِھل جائیں گی
اپنی شان سلامت رکھنا
عید کے دن کی عظمت رکھنا

اچھی تھی ناں

ایس عرفان آفاق، کراچی

کہانی واقعی دلچسپ اور سسپنس سے بھرپور تھی۔ جس مصنف نے یہ کہانی لکھی تھی وہ ہمیشہ اپنی کہانیوں میں پوری طرح انصاف کرتا تھا۔ میں نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ اس کی لکھی ہوئی کہانی پڑھنے میں مشغول تھا۔ مصنف نے شہر کراچی کے ایک نوجوان کو ملک دشمن عناصر کے ساتھ برسرِ پیکار دکھایا تھا پھر حقیقی جگہوں اور ناموں نے کہانی میں حقیقت کے رنگ بھر دیئے تھے۔ میں کیونکہ کچھ جذباتی واقعی ہوا ہوں اس لئے اپنے آپ کو اس کہانی کا کردار سمجھ رہا تھا۔

اب کہانی اختتامی موڑ پر تھی۔ نوجوان آصف کو ملک دشمن عناصر نے کراچی کے مشہور تفریح مقام کیپ ماؤنٹ کی پہاڑیوں میں قید کر رکھا تھا۔ آصف ان ملک دشمن عناصر کے لئے بہت بڑا خطرہ بنا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف ان کی تمام سرگرمیوں سے واقف تھا بلکہ ان تمام لوگوں کے نام و پتے بھی جانتا تھا۔ جو ملک سے وفاداری کی آڑ میں اسے دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔ آصف کسی طرح کیپ ماؤنٹ کی ان پہاڑیوں میں واقع قید خانہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ملک دشمن عناصر اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ پیراڈائز پوائنٹ پہنچ گیا۔ جہاں تفریح طبع کے لئے لگی ہوئی بینچوں میں سے آخری بینچ پر آصف نے پشت کی جانب چاک سے پہلے تو کراس کا نشان لگایا اور پھر پہلے پائے کے پاس گڑھا کر کے ایک کاغذ پر کوئلے سے ملک دشمن عناصر کے نام اور پتے لکھ کر جوس کے

ڈبے میں چھپا دیئے۔

پھر گڑھے کو پر کر دیا تاکہ وہ اگر پکڑا جائے تو تفریح کے لئے آئے ہوئے کسی بندے کا ذہن اس نشان اور ڈبے کی طرف چلا جائے اور وہ اسے پڑھ کر پولیس کے حوالے کر دے۔

پھر یہ ہوا کہ آصف دوبارہ پکڑا گیا لیکن چوں کہ اس نے بینچ کے قریب جو نشانیاں لگائی تھیں اتفاق سے تفریح کے لئے آئے ہوئے کچھ نوجوانوں کی نظر اس پر پڑیں تو انہوں نے جوس کے ڈبے میں رکھے گئے نام و پتے پولیس تک پہنچا دیئے اس طرح آصف اپنی ہوشیاری اور حاضر دماغی سے، جرائم پیشہ افراد کو ان کے کئے کی سزا دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ مصنف نے یہاں کہانی کا اختتام کر دیا تھا مگر میرا ذہن اس کاغذ میں اٹکا ہوا تھا۔ جو آصف نے پیراڈائیز پوائنٹ کی آخری بینچ کے نیچے جوس کے ڈبے میں چھپایا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ کہانی اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ جوس کا ڈبا جو گڑھے کے اندر چھپا دیا گیا تھا..... نوجوان کو وہ نظر کس طرح آیا ہو گا؟ میرے خیال میں یہاں مصنف نے کہانی کے اندر ایک بڑی کمزوری چھوڑ دی تھی۔

دن گزرتے گئے اور وہ کہانی میرے دماغ کے نہاں خانوں میں پوشیدہ ہوتی چلی گئی پھر ایک دن تمام خاندان نے پکنک کا پروگرام بنایا۔ میرے چہیتے ماموں ظفر انکل کا اصرار تھا کہ "ہاکس بے" جایا جائے۔ چنانچہ ایک بس میں بھر کر ہم سب پیراڈائیز پوائنٹ پہنچے۔ تمام کزن سامان وغیرہ اٹھانے میں مصروف ہو گئے اور میں بھاگم بھاگ بینچوں کی اس قطار کے پاس پہنچ گیا اور جب آخری بینچ کے قریب پہنچا تو میرے ذہن کے پردے پر وہ کہانی کسی فلم کی طرح چلنے لگی جو میں نے کچھ عرصہ پہلے پڑھی تھی مجھے کہانی کے سارے واقعات یاد آنے لگے پھر میری نظر بینچ کے پائے پر پڑی تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

آخری بینچ کی پشت پر بالکل ویسا ہی کراس کا نشان موجود تھا میں نے ایسے ہی انجانے میں اپنے ہاتھوں سے بینچ کے پہلے پائے کے پاس کی زمین کو کھودنا شروع کر دیا۔ اچانک میرا ہاتھ کسی ڈبے سے ٹکرایا۔ میں نے اسے نکال تو لیا مگر میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اسے کھول سکوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک کہانی بھی حقیقت کا روپ دھار سکتی ہے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ڈبے کو کھولا۔ دیکھا تو اس میں ایک کاغذ موجود تھا۔ مگر میرے ہاتھ شاید سُن ہو چکے تھے۔ میرے کزن مجھے آوازیں دے رہے تھے مگر مجھے کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر بڑی ہمت کر کے میں نے کاغذ کھولا تو اس پر کوئلے سے جلی حرفوں میں تحریر تھا۔

"کہانی اچھی تھی ناں....."

خرگوش

ایک معصوم جانور

سارہ قرۃ العین خانم، سیالکوٹ

خرگوش ایک بہت ہی معصوم اور بھولا بھالا جانور ہے۔ دیکھنے میں خوش نما لیکن خاموش اتنا کہ آپ نے شاذ و نادر ہی اس کی آواز سنی ہوگی۔ بھاگنے میں پھرتیلا۔ لمبے کان۔ لمبے کانوں کی وجہ سے اکثر لوگ اسے گدھے کا رشتہ دار کہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ خرگوش کی رشتہ داری چوہوں کے خاندان "جوندوں" یا کترنے والے جانوروں سے ہے۔ یہ ایک بہت ہی وسیع خاندان ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ زمینی ممالیہ کا ایک تہائی حصہ کترنے والے جانوروں پر مشتمل ہے۔

خرگوش کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اوپر والے ہونٹ میں دراڑ ہوتی ہے یہ ایک وراثتی چیز ہے۔ اس کی پچھلی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں۔ جو اسے بھاگنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس کی آنکھیں موٹی ہوتی ہیں۔

اس کی دم روئی کے گالے کی طرح سفید اور گچھے دار ہوتی ہے۔ خرگوش دو طرح کے

ہوتے ہیں۔ انگریزی میں خرگوش کو (RABBIT) اور ارنب کو (HARE) کہتے ہیں۔ گو ہماری بول چال میں ارنب کا لفظ عام نہیں ہے تاہم لغت میں یہ لفظ موجود ہے اور اسے (HARE) کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں یہ بات عام ہے کہ خرگوش پالتو کو کہتے ہیں اور ارنب جنگلی خرگوش کو۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ ارنب عام طور پر جنگلی ہوتے ہیں۔ خرگوش پالتو بھی ہوتے ہیں اور جنگلی بھی لیکن اصل فرق یہ ہے کہ خرگوش کے کان اور پچھلی ٹانگیں ارنب کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹی ہوتی ہیں۔

خرگوش بھٹ میں رہتے ہیں۔ مادہ خرگوش ایک بار میں تین سے سات بچے دیتی ہے۔ جب تک وہ پندرہ دن کے نہیں ہو جاتے، دن رات ایک نرم پالنے میں پڑے رہتے ہیں۔ مادہ خرگوش ایک سال میں کئی بار بچے جنتی ہے اور اپنی نسل تیزی سے بڑھاتی ہے۔ ان کے بچے پیدائش کے وقت اندھے اور بے سہارا ہوتے ہیں اور جسم پر بال بھی نہیں ہوتے۔ جبکہ ارنب میں پیدائش کے وقت بچوں کی آنکھیں کھلی اور بال نرم ہوتے ہیں۔ یہ شروع ہی سے چست و چالاک ہوتے ہیں اور زمین پر گھونسلے نما گھر بنا کر رہتے ہیں اور زیر زمین نہیں جاتے قد و قامت میں یہ خرگوش سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔

ان تمام شناختی خواص کے باوجود خرگوش کا نام دونوں کے لئے عام ہے۔ ارنب کا کام صرف جنگل میں رہنا ہے۔ رومن نے بڑی کوشش کی کہ ان کو پالتو کیا جائے لیکن ان کی حُرّیت آڑے آئی اور بقول اقبالؒ

اے طائر لاہوتی اس رزرق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

خرگوش کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ گھاس اور سبزہ پر گزارہ کرتا ہے لیکن ان کا معدہ گائے، بیل کی طرح چار خانوں کے بجائے صرف ایک خانہ میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا شمار جگالی کرنے والے جانوروں میں نہیں ہوتا۔

خرگوش بنیادی طور پر شمالی افریقہ کا جانور ہے اور بہت عرصہ پہلے غالباً کوئی باشندہ اسے یورپ لے آیا اور جہاں سے پھر یہ باقی دنیا میں پھیل گیا۔ اگر انسان خرگوش میں دلچسپی نہ لیتا تو یہ کبھی کا معدوم ہو چکا ہوتا۔

۳۶ قبل مسیح میں خرگوش کا اٹلی میں پایا جانا تاریخی طور پر ریکارڈ پر ہے۔ "ویرو" نے زراعت کی کتاب میں لکھا ہے کہ خرگوشوں کو فربہ کرنے کے لئے باڑوں میں پالا جاتا ہے۔ آج کے جنگلی خرگوش دراصل انہی پالتو....خرگوشوں کی نسل ہیں۔ جو پالتو زندگی سے فرار حاصل کر کے جنگل میں جا بسے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ عام طور پر جنگلی جانوروں کو پالتو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر الٹ ہے کہ آج کے جنگلی خرگوش کبھی پالتو تھے۔

خرگوش کھانے کے بارے میں زیادہ نخرے

نہیں کرتا، جو مل جائے کھا لیتا ہے مثلاً گھاس درختوں کی چھال، پھل، اور ہر طرح کی سبزی، سبزی کے پتے تو خوش ہو کر کھاتا ہے۔ اور کبھی باغیچے میں گھس جائے تو بوئی ہوئی سبزیوں کے پتے کُتر کُتر کر انہیں ختم کر دیتا ہے۔

خرگوش اپنی تعداد بڑی تیزی سے بڑھاتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک جوڑے سے صرف تین سال کے عرصے میں ایک کروڑ بیس لاکھ خرگوش پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس لئے جہاں ان کی آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے وہاں فصلوں وغیرہ کو نقصان ہو سکتا ہے۔ ہر سال لاکھوں خرگوش مختلف قسم کے شکار کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی آبادی متوازن رہتی ہے۔

خرگوش اپنے بھولپن کے باوجود ہوشیار جانور ہے۔ دشمن سے ہمیشہ چوکنا رہتا ہے۔ جب کوئی خرگوش غذا کی تلاش میں باہر نکلتا ہے تو پہلے اپنے دشمن کا خیال رکھتا ہے۔ اگر کوئی دشمن نظر آ جائے تو وہ زمین کا رنگ دیکھ کر چپ چاپ کہیں دبک جاتا ہے اس لئے دشمن زیادہ تر اسے دیکھ نہیں پاتا۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اس کے بڑے بڑے کان سننے میں مدد دیتے ہیں۔ ذرا آہٹ ہوئی، اپنی لمبی ٹانگوں سے تیزی سے بھاگتا ہے۔ اور پھر ایک دم رک جاتا ہے۔ یہ اس کی چالاکی ہے۔ دشمن اس کے پیچھے بھاگتا ہے جب یہ رک جاتا ہے تو دشمن آگے نکل جاتا ہے اور خرگوش میاں اپنے دشمن کو غچا دے کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔

دنیا میں خرگوش کی ۱۵۰ اقسام ہیں اس میں سے پاکستان میں تین چار ملتی ہیں۔ پہلے کو انڈین خرگوش کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسری قسم صحرائی خرگوش ہے۔ یہ بر صغیر شمال مغربی حصے میں کھیتوں کے قریب غیر کاشت شدہ علاقوں میں رہتا ہے۔ دم کی اوپری سطح بھوری ہوتی ہے۔ کان چوڑے اور لمبے ہوتے ہیں۔ شکاری اس کا شکار کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ایک قسم کیپ ہیئر بھی ہے۔ یہ بلوچستان، گلگت اور چترال میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مالا کنڈ، سوات اور دیر میں بھی ملتا ہے۔ ایک قسم عربی خرگوش ہے۔ یہ بلوچستان میں پایا جاتا ہے۔

خرگوش بہت سے ممالک میں گائے بھینسوں کی طرح پالا جاتا ہے۔ تاکہ ان سے گوشت حاصل کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے تقریباً دس نسلیں پالی جاتی ہیں۔ بعض خرگوشوں کی کھال نرم ملائم اور جاذب نظر ہوتی ہے ایسی نسل خاص طور پر کھال کے لئے پالی جاتی ہے۔ ■

جدید کہاوتیں مرسلہ: مختار حسین، لیاقت پور

چار دن کی بجلی پھر لوڈ شیڈنگ۔
بغل میں کتابیں زبان پر نعرے۔
سائنس سے گرا آرٹس میں اٹکا۔
کرکٹ کا کھلاڑی اور امپائر سے بیر۔

صلہ شہید کیا ہے؟

مرسلہ..... محمد سلیم، چکوال

حق کی خاطر مر جاتے ہیں
طوفانوں سے لڑ جاتے ہیں
دشمن ان سے تھراتے ہیں
پاک وطن کے پاک مجاہد
دِل والے بے باک مجاہد
ان کا لوہا مان گئے سب
ان کی شجاعت جان گئے سب
پاک وطن کے پاک مجاہد
دِل والے بے باک مجاہد
پرچم ان کا چاند ستارہ
اونچا اونچا پیارا پیارا
پاک وطن کے پاک مجاہد
دِل والے بے باک مجاہد

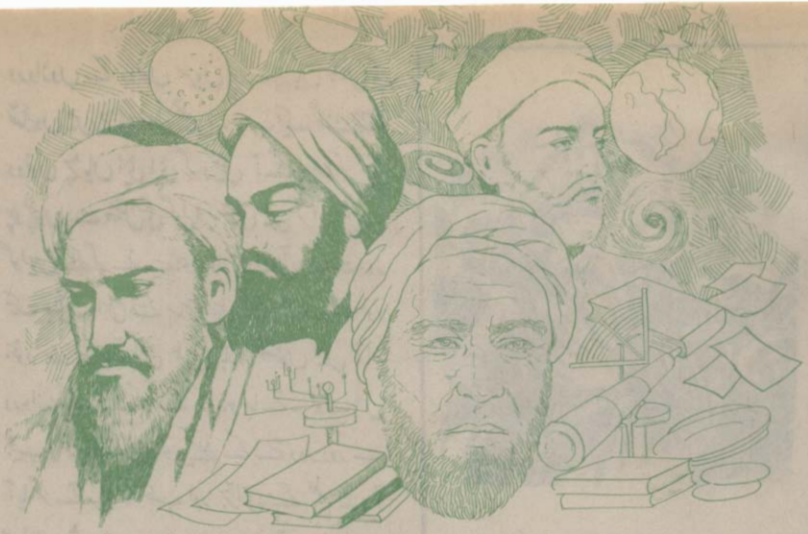

مسلمانوں کی ایجادات

عدیل احمد

مسلمانوں کی عظیم الشان ایجادوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ہم آپ کو چند ایسی ایجادوں کا حال سُناتے ہیں۔ جن سے ہم بہت فائدہ تو اُٹھاتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہ ہمارے اپنے بزرگوں ہی کے کارنامے ہیں۔ میر فتح نامی ایک مسلمان نے ایک ایسی بندوق بنائی تھی جو ایک وقت میں بارہ گولیاں چھوڑتی تھی۔ گھڑیاں اب گھر گھر میں موجود ہیں۔ ان کے بغیر کسی بھی وقت ہمارا کام نہیں چلتا لیکن یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ پہلی گھڑی ابنِ یونس نامی ایک مسلمان نے بنائی تھی۔ رفتہ رفتہ مسلمان اس فن میں بڑے ماہر ہو گئے اور انہوں نے بے شمار عجیب و غریب گھڑیاں بنائیں۔ خلیفہ ہارون رشید نے فرانس کے بادشاہ کو تحفے کے طور پر ایک ایسی گھڑی بھیجی تھی جس کے اندر پیتل کے سوار تھے۔ گھڑی جتنے گھنٹے بجاتی اتنے ہی سوار ایک ایک کر کے باہر نکلتے اور پھر اندر چلے جاتے۔ اسی خلیفہ کے زمانے میں شہر دمشق کی ایک بڑی سی عمارت میں ایک طاق تھا۔ اس طاق میں پیتل کی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں ہر کھڑکی میں چھوٹے چھوٹے دروازے لگے ہوئے تھے۔

دروازوں کے دونوں سروں پر دو چڑیاں پیتل کی تھالیوں میں جڑی ہوئی تھیں۔ جب ایک گھنٹہ بجتا تو دونوں چڑیاں اپنی اپنی گردنیں آگے بڑھا کر اپنی چونچوں سے پیتل کی گولیاں تھالی میں گرا دیتیں۔ گولیاں کے گرنے سے جو آواز پیدا ہوتی وہ بہت دور تک جاتی۔ اس کے ساتھ ہی گھنٹے والا دروازہ خود بخود بند ہو جاتا اس طرح بارہ گھنٹوں میں تمام دروازے ایک ایک کر کے بند ہو جاتے۔ لوگ اس عجیب و غریب گھڑی کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آیا کرتے تھے۔ طب اور جرّاحی کے علم میں تو مسلمان شروع ہی سے بہت ماہر تھے۔ مسلمان جرّاحوں نے ایسے مرہم بنائے تھے جن کے لگانے سے گہرے سے گہرا زخم چند دنوں میں اچھا ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ مصر کے ایک حکمراں کے لئے ایک مسلمان حکیم نے ایک ایسا باجا بنوایا تھا جس کی آواز سُنتے ہی پیٹ کا درد ختم ہو جاتا تھا۔ ■

معلومات عالم

○ خود کشی کے ذریعہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ اموات جاپان میں ہوتی ہیں۔

○ پارسی مذہب میں مُردے کو چھونا منع ہے۔

○ نظام شمسی کا سرد ترین سیارہ "پلوٹو" ہے۔

○ لکھنے کا فن انسان نے تقریباً ۱۵۰۰ ق۔ م میں ایجاد کیا۔

○ اصحاب کہف کے کتے کا نام "قطمیر" تھا۔

مرسلہ..... شازیہ وحید. کراچی

ٹیپو کی تلوار بنو تم

منوّر احمد صدیقی، کراچی

پڑھ لکھ کر تم بنو مجاہد
حق کی خاطر کٹ کے دکھاؤ
ٹیپو کی تلوار بنو تم
بازو طارق کا بن جاؤ
سچ کی خاطر جینا سیکھو
جھوٹ کے آگے سر نہ جھکاؤ
دشمن ہو جب تم مقابل
شعلہ، شبنم سے بن جاؤ
جو کہتے ہو کرو منوّر
کبھی نہ جھوٹی شان دکھاؤ

بلّی کہاں ہے

مرزا احمد خان، کراچی

ڈرامہ

کردار:۔

عائشہ (ایک لڑکی)

عثمان (اس کا بھائی)

اعظم صاحب (ان کے پڑوسی)

خرم صاحب (ایک اور پڑوسی)

سین (رات گھر کے باہر کا منظر)

عثمان: "تم رو کیوں رہی ہو عائشہ! اور کس کو ڈھونڈ رہی ہو؟"

عائشہ: "مجھے اپنی بلی نہیں مل رہی (ادھر ادھر دیکھتی ہے اور منہ سے آواز نکالتی ہے) "میاؤں میاؤں۔ پچ پچ"

عثمان: میں ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کرتا ہوں ہو سکتا ہے وہ جھاڑیوں میں چھپی بیٹھی ہو۔"

عائشہ: وہ گھر میں نہیں ہے۔ اور ادھر بھی کہیں نہیں ہے ہو سکتا ہے پڑوس والوں کے گارڈن میں ہو۔"

عثمان: میں وہاں جا کر دیکھتا ہوں تم گھر پر رہنا۔" (عثمان پڑوس کے گارڈن میں جا کر دیکھتا ہے۔)

"پچ پچ۔ میاؤں۔ میاؤں"

اعظم صاحب کھڑکی سے باہر جھانکتے ہیں)

اعظم صاحب: (غصے میں) "یہ پھر آگئی اور آوازیں نکال رہی ہے۔ کون چپ کرائے گا اسے؟"

(کھڑکی سے جوتا مارتے ہیں جو عثمان کے سر پر لگتا ہے)

عثمان: "اوہ! میرا سر! یہ اعظم صاحب ہوں گے وہ سمجھے کہ میں بلی ہوں۔ شاید بلی خرم صاحب کے گارڈن میں ہو۔ میں وہاں دیکھتا ہوں عثمان سر سہلاتا ہوا خرم صاحب کے گارڈن میں میں جا کر دیکھتا ہے "پچ۔ پچ۔ میاؤں میاؤں!!"

خرم صاحب کھڑکی کھولتے ہیں۔

خرم صاحب: (غصے میں) یہ وہی بلی ہے۔ پانی کی بالٹی پھینکتے ہوئے "اب بھاگ جائے گی۔"

پانی عثمان پر گرتا ہے اور وہ گھبرا جاتا ہے۔

عثمان: (کانپتے ہوئے) "اوہ! ٹھنڈا پانی۔ مجھے گھر جا کر کپڑے تبدیل کر لینے چاہئے!!"

دروازے پر عائشہ ملتی ہے۔

"تم آ گئے عثمان! میں نے بلی ڈھونڈلی ہے۔"

عثمان: تمہیں کہاں ملی؟"

عائشہ: یہ گھر میں تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے سو رہی تھی۔ اوہ! تم گیلے ہو رہے ہو۔ کیا ہوا؟"

عثمان: "پہلے اعظم صاحب نے مجھے جوتا مارا جو میرے سر پر لگا پھر خرم صاحب نے میرے اوپر ٹھنڈا پانی پھینکا۔ دونوں سمجھے کہ میں بلی ہوں۔

عائشہ: "اوہ! سوری عثمان!!"

عثمان: مجھے جا کر کپڑے تبدیل کر لینے چاہئے۔ مجھے نزلہ ہو رہا ہے۔ آ آ آہ..... چھو۔" (زور سے چھینک آتی ہے)

عائشہ: "تم بہت اچھے ہو عثمان دوسروں کے کام آنے والے۔ بہت شکریہ تمہارا!!"

عثمان اپنے کمرے کی طرف جاتا ہے اور عائشہ اپنی بلی سے کھیلنے لگتی ہے۔ ■

ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

شاعر: صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

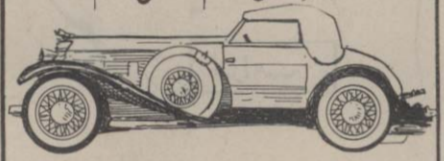

ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار
اس موٹر کی شان نرالی
دو سیٹوں دو پہیوں والی
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار
اس کا اللہ بیلی
کوئی نہ ہو تو پھرے اکیلی
گھومے گلی گلی بازار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار
ساتھ ہوا کے اُڑتی جائے
دائیں بائیں مُڑتی جائے
بڑی ہی سیانی بڑی ہوشیار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

مرسلہ..... محمد سلیم امام، العین

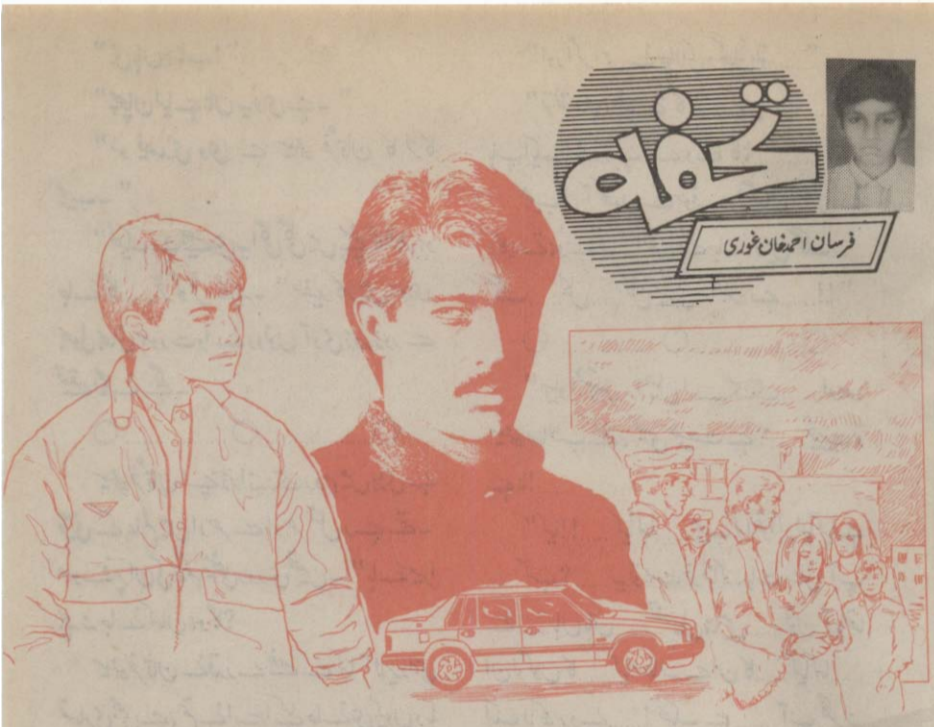

تحفہ

فرسان احمد خان غوری

مصنف بتائیے انعام پائیے

فرسان احمد خان غوری کی اصلاح طلب کہانی کو ایک مقبول مصنف نے لکھا ہے۔ آپ کو اس مصنف کا نام بتانا ہے۔ یاد رہے کہ اس مصنف کا قسط وار ناول بچوں کے ایک پرچے میں چھپ رہا ہے۔

بالکل درست جواب بوجھنے والے ساتھی کو آنکھ مچولی چھ ماہ کے لئے اعزازی روانہ کیا جائے گا۔

اپنے درست جوابات اس پتے پر ارسال کیجئے: قلم دوست، آنکھ مچولی۔ ا۔ پی آئی بی کالونی، کراچی۔

"ٹھیک ہے ہم ضرور آئیں گے۔" احمد، فراز، فخر اور جمیل نے ایک ساتھ کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے میں اب چلتا ہوں۔ عمیر، شرجیل، اظہر اور فیصل کو بھی دعوت دینی ہے۔"

"ہاں ہاں تم نکلو...... حالات بھی خراب ہیں فائرنگ کی آوازیں آرہی ہیں۔" دوستوں کی یہ بات سُن کر مجیب نے ہاتھ ہلایا اور اسپورٹس سائیکل چلاتا ہوا گلی سے باہر نکل گیا۔

○ .... ○ .... ○

"تم اسے دیکھ رہے ہو۔"

"جی ہاں جناب!"

"پہچان لیا ہے ناں یہ وہی ہے۔"

"سو فیصدی وہی ہے سیٹھ فرقان کا لڑکا مجیب۔"

"ٹھیک ہے جیسے ہی یہ اگلی گلی میں پہنچے گاشکار ہو جائے گا..... خرگوش کا بچہ۔" سفید کار میں موجود بھولی بھالی صورت والے دونوں آدمی زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔

○ ..... ○ ..... ○

سیٹھ فرقان اپنے ڈرائینگ روم میں بڑی بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ صوفے پر ان کی بیگم بیٹھی رو رہی تھیں۔ "ہائے میرا بچہ نہ جانے کہاں ہو گا؟

سیٹھ فرقان نے قدرے غصے سے کہا "لاپرواہی تمہاری بھی ہے، تم نے اسے اکیلے جانے ہی کیوں دیا تھا؟ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ شہر کے حالات کس قدر خراب ہیں۔"

عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی گنگنا اٹھی۔ سیٹھ فرقان تیزی سے فون کی طرف لپکے۔

○ ..... ○ ..... ○

مجیب ہراساں نظروں سے اس شخص کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جو فون پر اس کے والد سے گفتگو کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بات چیت ختم کر کے اس کی طرف پلٹ آیا۔ کمرے میں موجود دوسرے شخص نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس نے سر کو جنبش دی۔ "کام بن جائے گا....."

"اور اگر اس نے چالاکی دکھائی تو....."

"تو نقصان اٹھائے گا..... کیوں بے..... تیرا باپ ایک لاکھ روپے دے دے گا نا....."

مجیب کی آنکھوں سے خوف دوڑ گیا..... اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "انکل مجھے جانے دیں کک..... کک..... کل..... کل میری سالگرہ ہے.....!!"

○ ..... ○ ..... ○

"ہیلو انسپکٹر راحیل اسپیکنگ ..... اوہو، سیٹھ صاحب کہئے، کیسی طبیعت ہے؟..... خیریت تو ہے نا!.....

"کیا!!..... کیا کہا..... مجیب کو اغوا کر لیا گیا ہے ..... کب؟..... یہ تو بہت خوفناک بات سنائی آپ نے..... ہاں ہاں..... تفصیل بتائیں..... فون آیا تھا ان لوگوں کا..... کیا مطالبہ ہے ان کا..... کیا کہا..... ایک لاکھ روپے.....! ٹھیک ہے..... آپ فکر نہ کریں..... میں آپ کے پاس آ رہا ہوں....."

انہوں نے چونگا رکھ کر، کیپ سر پر جمائی، اردلی کو بلا کر کچھ ہدایت دیں اور تیزی سے سیٹھ فرقان کے بنگلے کے طرف چل دیئے۔ بنگلہ برقی قمقموں کی روشنی سے جگمگ جگمگ ہو رہا تھا لیکن اندر سکوت چھایا ہوا تھا۔

○ ..... ○ ..... ○

"تو اس کا مطلب ہے اس مرتبہ جو روپیہ ہمارے ہاتھ لگے گا، تم اس میں سے ہمیں حصہ نہیں دو گے۔"

مجیب کو اغوا کرنے والے دونوں افراد کمرے سے

باہر نکل آئے تھے، اور باہر کھڑے باتیں کرنے میں مگن تھے۔

"ہاں اس رقم میں سے جو سیٹھ فرقان ہمیں دے گا، میں کسی کو کچھ نہیں دوں گا، اگلے شکار میں سے سب کچھ تم لے لینا..... دراصل کل میرے بیٹے نبیل کی سالگرہ ہے، اور میں نے اس مرتبہ وعدہ کیا ہے کہ اسے کمپیوٹر لے کر دوں گا، تمہیں معلوم ہے کمپیوٹر کتنا مہنگا ہے، اور میرے بیٹے کو کمپیوٹر کا کتنا جنون ہے۔"

"ہاں یار..... تیرا بیٹا..... تو لگتا ہے سائنس دان بنے گا..... اس میں تیری تو کوئی خصوصیت ہی نہیں ہے۔" دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

○ ..... ○ ..... ○

دوسرے دن فرقان کی سالگرہ سیٹھ فرقان نے رکھنے نہیں دی تھی۔ ان کے بنگلے پر مہمانوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی، اور ان کی پریشانی عروج پر تھی، انسپکٹر راحیل ان سے ایک بریف کیس میں ایک لاکھ روپے لے کر گئے تھے اور ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

احمد، فراز، فخر اور جمیل دالان میں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"کیا ہوا انکل، مجیب ابھی تک تیار نہیں ہوا؟" احمد نے مجیب کے والد سے پوچھا۔

"آں..... ہاں" وہ اپنی سوچوں کے گھیرے سے باہر نکل آئے..... "بس بیٹا..... آتا ہی ہوگا، تم مشروب لو ناں!"

○ ..... ○ ..... ○

نبیل نے اپنے والد کو ایک بڑے سا پیکٹ اٹھا کر آتے ہوئے دیکھ لیا۔

"ارے ڈیڈی..... آپ ٹھیک وقت پر آگئے ..... اور یہ.....؟"

"یہ تمہارا کمپیوٹر ..... تمہاری بارہویں سالگرہ کا تحفہ.....!!"

"اوہ تھینک یو..... ڈیڈی..... آیئے سب لوگ کیک کٹنے کے منتظر ہیں اور میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا..... میرے سارے دوست بھی آگئے ہیں ۔"

اس کے دوست دور کھڑے رشک بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے....." ایک نے کہا۔ "یار، نبیل کے پاپا کتنے دولت مند ہیں۔ اس کی سالگرہ پر اسے کتنا قیمتی تحفہ دیا ہے.....!!"

دوسرے نے پوچھا "اس کے پاپا کیا کاروبار کرتے ہیں؟"

○ ..... ○ ..... ○

"ہاں کیا رپورٹ ہے....." انسپکٹر راحیل نے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا۔

"کامیابی سر!..... ہمارے نوٹ کئے ہوئے نمبروں والے نوٹ الائیڈ بینک کی صدر برانچ میں جمع کرائے گئے ہیں۔"

"گڈ..... معلوم ہوا کس نے جمع کرائے ہیں ....."

"جی سر! کمپیوٹر فروخت کرنیوالی ایک کمپنی کی

جانب سے جمع کرائے گئے ہیں۔"

"شاباش...... آؤ، چلیں......!!"

○ .... ○ .... ○

مجیب کی والدہ نے دوڑ کر مجیب کو سینے سے لگالیا۔ ممتا کے آنسو چھلک کر رخساروں تک بہتے چلے آئے۔

"کہاں چلا گیا تھا میرا چاند......؟"

سیٹھ فرقان نے بے تابی سے آگے بڑھ کر مجیب کا ماتھا چوما...... "انہوں نے تمہیں مارا تو نہیں تھا......"

"نہیں ابو...... انہوں نے تو مجھے کچھ بھی نہیں کہا......" مجیب کا جواب سادہ تھا۔

فخر نے کہا "یار مجیب، کیک تمہارا انتظار کر رہا ہے"

○ .... ○ .... ○

"ہیلو امجد صاحب!" انسپکٹر راحیل کی آواز بڑی پاٹدار تھی۔

سب نے چونک کر دیکھا، انسپکٹر راحیل چند سپاہیوں کے ساتھ دروازے میں کھڑے تھے۔

"امجد صاحب کے چہرے پر خوف سرائیت کر گیا...... کک...... کیا مطلب......؟"

ہمارے پاس آپ کے لئے ایک شاندار تحفہ ہے......!!"

"تحفہ!......؟" نبیل نے چونک کر ڈیڈی کی طرف دیکھا...... جن کا رنگ سفید ہو چلا تھا۔

انسپکٹر راحیل نے آگے بڑھ کر ہتھکڑیوں کا تحفہ معصوم بھولے بھالے سے نظر آنے والے نبیل صاحب کے ہاتھوں میں ڈال دیا......!!

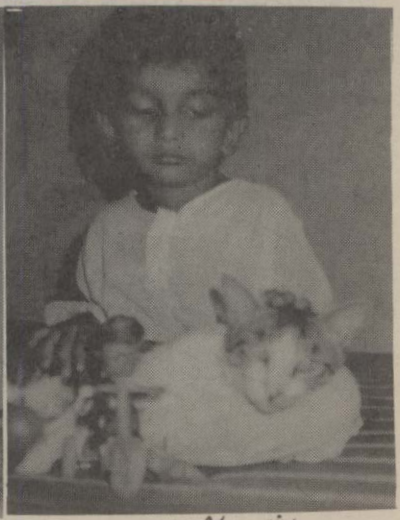

اُشنیٰ، کاچو کوما اور سارجنٹ

شبیر، عاشو اور اصغر خان

کیسی لگیں سبزیاں

عبدالطیف شیخ، کراچی

لیموں:۔

یہ صحت افزا اور حسن پرور ہوتا ہے۔ اس میں حیاتین ج بے حد ہوتا ہے۔ اس کا رس خلیات کو مضبوط، مسوڑھوں کو صحت مند اور جگر کے کام کو درست کرتا ہے۔

تیز دھوپ میں تازہ لیموں کا رس ٹھنڈے پانی میں شکر ملا کر پینے سے بڑی راحت ہوتی ہے۔ ملیریا میں لیموں پر نمک اور کالی مرچ لگا کر چوسنے سے بخار کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ ہیضے کے موسم میں لیموں، پیاز اور پودینے کی چٹنی کھانے سے مرض کا حملہ نہیں ہوتا۔

اِملی:۔

اس کے استعمال سے بھوک خوب لگتی ہے۔ متلی اور بدہضمی ہو تو پودینے کے ساتھ اس کی چٹنی فائدہ پہنچاتی ہے۔

تُلسی:۔

گلے میں خراش ہو یا حرارت محسوس ہو رہی ہو تو تلسی کے تازہ پتے استعمال کریں۔ اس سے معدے کی کمزوری اور گیس کی بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

لہسن:۔

یہ بلڈ پریشر کے علاوہ چھوت دار امراض، نزلہ، زکام اور کھانسی وغیرہ کے لئے بہترین ہے۔

اس کے استعمال سے سرطان کا مرض دور ہوتا ہے۔

ادرک:۔

جلد ہضم ہوتی ہے۔ یہ اپھارہ، پیٹ کا درد، کھانسی دمہ اور گٹھیا جیسے امراض کا موثر علاج ہے۔

پیٹ کی تکلیف کے لئے ادرک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نمک لگا کر کھانے سے قبض اور ریاح سے نجات مل جاتی ہے۔ اس کے رس کو گرم پانی میں ایک چمچہ گڑ یا شہد کے ساتھ ملا کر پینے سے نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور سانس کی تکلیف میں بھی فائدہ ہوتا ہے۔

بینگن:۔

اس کا پانی لگانے یا پیس کر لیپ کرنے سے ہاتھ یا پاؤں سے پسینہ نکلنے کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ اس میں ورم دور کرنے کی بہت صلاحیت ہوتی ہے۔

اجوائن:۔

پیٹ میں ریاح کی تکلیف اور درد کی صورت میں کالے نمک کا ایک کنکر اور دو چٹکی اجوائن کھانے سے افاقہ ہوتا ہے۔ یہ معدے اور آنتوں کے کئی امراض کا علاج ہے۔ اجوائن کھانے سے جگر کی تکلیف کا خاتمہ ہوتا ہے بھوک لگتی ہے۔ نزلے کی صورت میں اجوائن کو ایک پوٹلی میں باندھ کر گرم کر کے سونگھنے سے نزلہ جاتا رہتا ہے ■

ننھی غزل

عبداللہ ادیب، پشاور شہر

رات کو جب ہم سو جائیں
خواب ہمیں کچھ ایسے آئیں
جھٹ سے بھیّا ہم بن جائیں
آنکھیں بھیّا جب دِکھلائیں
اپنی سائیکل تیز چلائیں
آنکھ ہماری پھر کُھل جائے
رات کو جب ہم سو جائیں

خواب ہمیں کچھ ایسے آئیں
جھٹ سے بھیّا ہم بن جائیں
بچّوں پر ہم رعب جمائیں
امّی جوتی جب لہرائیں
آنکھ ہماری پھر کُھل جائے
پتنگ ہوا میں خوب اُڑائیں
تیز چلیں جب خوب ہوائیں
آنکھ ہماری پھر کُھل جائے

اس طرح تو ہوتا ہے

محمد اجمل انصاری، کراچی

دوسرے دن صبح سویرے جب میں ابھی بستر میں ہی تھا، میری آنکھ کھُل گئی۔ گھر میں سب لوگ جاگے ہوئے تھے اور عجیب طرح کی بھنبھناہٹ ہو رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ ہمارے گھر کے لوگ (سوائے امی ابو اور آپا کے) جو صبح دس ساڑھے دس بجے سو کر اُٹھتے ہیں آج فجر سے بھی پہلے کس طرح اُٹھ گئے ہیں۔

"کیا قیامت آگئی ہے؟" اب میں گھبرا کر بستر سے اُٹھ بیٹھا۔

"میرے خیال میں مجھے جلدی جلدی اپنے گناہوں کی معافی مانگ لینی چاہئے۔ ورنہ کہیں اللہ تعالیٰ معافی کا دروازہ بند نہ کر دیں۔" میں نے اتنا سوچا ہی تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر دھڑ سے بند ہو گیا۔ آپا کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ وہ میرے قریب آئیں۔

"اُٹھو منے میاں! قیامت آگئی ہے۔"

"اللہ خیر!" جس بات کا ڈر تھا وہی بات ہو گئی..... میں نے رات ڈرامہ دیکھنے کے چکر میں عشا کی نماز قضا کر دی تھی اب مجھے سخت افسوس ہو رہا تھا کہ وقت گزر گیا اور وہ قضا نماز میرے اعمال میں شامل ہو گئی۔ "تو کیا اس قضا نماز کی (جو میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دی تھی) سزا مجھے ملے گی؟"

"آپا! کیا ابھی توبہ کرنے کا وقت ہے کیا اللہ میاں مجھے تھوڑی دیر کے لئے مہلت دیں گے کہ میں اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکوں۔"

"نہیں ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا مل کر رہے گی۔ پہلے

ہمارے خراب اعمال کی وجہ سے "سپر پاور آریکا" نے ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور ہمارے اعمال ہی کی وجہ سے کسی سیارے کی مخلوق نے اب ہمارے وطن پر قبضہ کر لیا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے قیامت ابھی نہیں آئی ہے؟" میں نے سکون کا سانس لیا۔

"تو کیا سیارے کی مخلوق کا ہمارے وطن پر قبضہ کرنا کسی قیامت سے کم نہیں!!" آپا میرا اطمینان دیکھ کر حیرت سے بولیں۔ میں نے منہ بنایا اور پھر کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ "نہیں! یہ ملک اندھیر نگری چوپٹ راج ہے..... یہاں جنگل کا قانون نافذ ہے۔ طاقتور کمزور کو کھا جاتا ہے۔ حق داروں حق نہیں ملتا۔ انصاف کے طالب انصاف کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ روٹی کے بجائے گولی اور سکون کے بجائے منگائی ملتی ہے۔ جو لوگ گولی سے بچ جاتے ہیں انہیں منگائی مار دیتی ہے آپ دیکھ لیجئے ہمارے ملک میں کتنے ہی لوگ منگائی سے مر چکے ہیں ہمارے ابو کا گرلا کھوں روپے کا بزنس نہ ہوتا تو ہم لوگ بھی کبھی کے مر چکے ہوتے جب یہ قیامت نہیں تو پھر سیارے کی مخلوق کا زمین پر قبضہ کر لینا بھی قیامت نہیں۔"

میری لمبی چوڑی تقریر سن کر آپا بولیں۔

"تمہاری بات درست ہے لیکن اس ملک میں اندھیر اہم لوگوں کا ہی پھیلایا ہوا ہے۔ ہم لوگ کبھی ظلم کے خلاف نہیں اُٹھے۔ ظلم کرنے والوں کا ہاتھ ہی نہیں پکڑا بس چُپ چاپ ظلم سہتے رہے اور اللہ ظلم سہنے والوں کو بھی پسند نہیں کرتا اس لئے اس نے ہم پر ظالم حکمراں مسلط کر دیئے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن یہ اندھیر اہمارا نہیں حکمرانوں کا پھیلایا ہوا ہے مجھے ایک دن کی حکومت مل جائے تو میں سارے بدعنوان اور نااہل سیاستدانوں کو گولی مار دوں..... انہوں نے ہی عوام کو اس حالت تک پہنچایا ہے کہ لوگوں کو دو وقت کی روٹی کھانا اور عزت کی زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔"

میرا لہجہ بالکل سیاسی ہو چلا تھا۔ اس میں حیرت کی بات نہیں تھی۔ اندھیر نگری چوپٹ کا بچہ بچہ اس لفظ سے آشنا تھا۔

لوگوں کا سیاسی شعور تو بیدار ہو چکا تھا لیکن سماجی شعور منگائی اور آئے دن کے جھگڑوں کی نذر ہو گیا تھا اس لئے وہ ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے تھے حکمرانوں کو غلط کام سے نہیں روکتے تھے بس کولہو کے بیل کی طرح روٹی کمانے کے چکر میں ایک ہی دائرے میں گھومتے رہتے تھے۔

میرے دوست ظاہر بھگوڑی کو بھی ملک کے سیاستدانوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتا تھا "اللہ مجھے ڈائنوسار بنا دے گوشت کھانے والا ڈائنوسار!" (اصل میں گوشت اسے بہت پسند تھا اور وہ بہت شوق سے گوشت کھاتا تھا لیکن جب سے گوشت مہنگا ہوا تھا اس کے گھر میں مہینوں میں ایک آدھ دفعہ گوشت پکتا تھا اور سب کو صرف ایک ہی بوٹی کھانے کو ملتی تھی۔) میں حیران ہو کر جب اس سے پوچھتا کہ ڈائنوسار بن کر کیا تم تمام قصابوں کی دکانوں کا گوشت کھاؤ گے تو وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے کہتا "نہیں میں صرف اس ملک کے سیاستدانوں کا گوشت کھاؤں گا۔" تب میں ہنس دیتا اور اس سے کہتا لیکن ہمارے مذہب میں حرام گوشت منع ہے تو وہ بھی مسکرا اٹھتا اور پھر کہتا جب میں ڈائنوسار بنوں گا تو مجھے حرام حلال میں کوئی تمیز نہ ہوگی۔"

سیاست دانوں کی بات نکل آئی تھی۔ میں اور آپا سیاستدانوں کو کوستے ہوئے ڈرائینگ روم میں چلے آئے جہاں ٹی وی پر سی این این کی نشریات چل رہی تھیں اور سب لوگ ٹی وی کے گرد بیٹھے بڑی خاموشی سے نیوز ریڈر کو سن رہے تھے۔ ٹی وی پر بار بار وہ منظر دکھایا جا رہا تھا جب سیارے مخلوق زمین پر اُتر آئی تھی۔ نیوز ریڈر تفصیل بتا رہا تھا اور اسکرین پر اس مخلوق کو دکھایا جا رہا تھا۔ لمبی لمبی چادریں اوڑھے ہوئے کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان کا سر عجیب و غریب تھا۔ برسات کے زمانے میں جس طرح کھمبیاں اُگ آتی ہیں اسی طرح ان کے سر تھے لیکن چہرے انسانوں جیسے تھے۔ وہ لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں کے پاس کھڑے تھے ان بلڈنگوں کے اوپر "فرسبی" کی طرح کی اڑن طشتریاں تیر رہی تھیں۔

"یہ اونچی اونچی بلڈنگیں کیا انہوں نے بنائی ہیں؟" میرے لہجے میں بڑی حیرانی تھی۔ بھائی جان نے میری بات سُنی تو بولے۔ "یہ بلڈنگیں نہیں۔ بڑے بڑے راکٹ ہیں جو آریکا نے بنائے تھے۔ سیارے کی مخلوق نے ان پر قبضہ کر لیا ہے۔"

(جاری ہے)

شربت نورس انتہائی کاوش، جدید ترین مشینری کی مدد اور ماہرین کی انتھک کوششوں کو یکجا کر کے سائنٹیفک اصولوں کے تحت تکمیل کو پہنچتا ہے۔ نورس کا ذائقہ ہی اس کی خوبی نہیں بلکہ اس کا ایک ایک گھونٹ مفرح اور صحت بخش ہے۔ اسے دودھ، آئسکریم، کسٹرڈ اور قلفی میں استعمال کرنے سے لذت دوبالا ہو جاتی ہے اور موسم برسات میں تازہ لیموں کے ساتھ نورس فریش فلیم موسم کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

نورس
قومی مشروب

احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-112، نورس روڈ، سائٹ، کراچی 75700
فیکس: 021-2564570, 021-298195 ٹیلیکس: 21651 AHMED PK
فون نمبر 296045 (5 لائنیں)

REGD. No. M-266 MARCH 1995
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

نہ وقت کا زیاں نہ انتظار کی زحمت
پاکستان میں روزانہ ۱۸۲ پروازوں کی سہولت

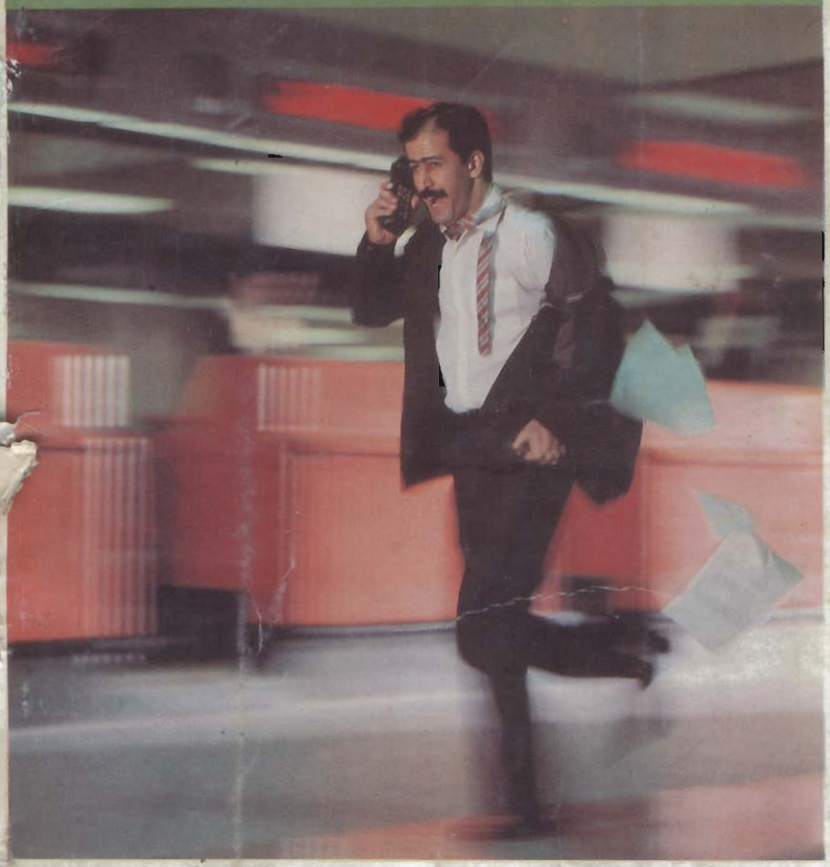

ان میں ہماری روزانہ ۷۴ بین الاقوامی پروازیں بھی شامل کیجئے تو ہم ہی آپ کو روزانہ دوسروں سے کہیں زیادہ مقامات تک پروازیں فراہم کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے اندرون ملک دائرۂ پرواز کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مثلاً صرف کراچی اور لاہور کے درمیان ہم روزانہ تقریباً سات پروازیں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک میں دیگر مقامات تک رسائی کے لئے ہم آپ کی سہولت کے مطابق ہر وقت تیار ہیں۔ پروازوں کا وسیع ترین دائرۂ کار ہمارے ساتھ سفر کا ایک اور جواز۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل